

جوش ملیح آبادی

انسان اور شاعر

مصنفہ

سید احتشام حسین

اثر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



جوش ملیح آبادی

(الِإِنْسَانُ أَوْشَاعٌ)

مصنف

سید احتشام حسین

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

جوش ملیح آبادی — انسانے اور شاعر

سید احسان حسین

۱۹۸۳ء	پمپلائیشن
۲۰۰۰	تعداد
۵/- روپے	قیمت

سٹیشن پندرہ سو سترہ اترپردیش اردو اکادمی نے نفاذ کرنا
 نمائندہ سے چھپو اگر بلبرہ ہاؤس قیصر پانچ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

جو لوگ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم سے قریب رہے ہیں یا جنہوں نے ان کی تحریروں کا عین مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرحوم نے پانچویں دہائی میں ہی جوش ملیح آبادی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر ایک مبسوط مگر جامع کتاب کی تصنیف کا طویل المیعاد منصوبہ مرتب کیا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ کتاب زیر دستہ تھی اور مرحوم نے اس کے بعض اجزاء اشاعت کے لیے بھی دے دیے تھے۔ انھوں نے کتاب کے ابواب قائم کر لیے تھے اور ہر باب کا خاکہ مرتب کر لیا تھا۔ ہر باب کے ذیل میں وہ اپنے خیالات قلم بند کرتے جاتے تھے۔ اس نامکمل کتاب کا مسودہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ مرحوم نے سواد فراہم کر لیا تھا، کتاب کو آخری شکل دینے کے لیے صرف فرصت اور کمیونی کی ضرورت تھی جو انھیں نصیب نہ ہو سکی۔ پھر بھی جوش کیا تھے، ان کے محرکات و عوامل کیا تھے، ان کا فن ارتقا کی کن منزلوں سے گزرا، ان سوالوں کا جواب احتشام صاحب کی نامکمل تحریروں میں مل جاتا ہے۔ ہر چند ان تحریروں میں وہ ربط نہیں ہے جو ایک مکمل کتاب کے ابواب میں ہونا ہے لیکن مجموعی ناظر کے لحاظ سے اسے مکمل کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ایک عظیم شخصیت کے شہساز و سابق میں درمیری عظیم شخصیت کے رشحات قلم ہیں جن سے ہمیشہ کتب نور کیا جاتا رہے گا۔

احتشام صاحب کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ جوش پر بھرپور کتاب لکھتے۔ وہ جوش سے اس وقت قریب ہوئے جب ان کا تصفیعی شعور پختگی کی تلاش میں تھا

اور معاصرین میں ان کی حیثیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ جوش کی شخصیت اور شاعری دونوں نے انھیں متاثر کیا اور خود جوش کا یہ حال تھا کہ تفاوتِ عمر کے باوجود احتشام صاحب کا احترام کرتے تھے۔ جوش کب کسی کو خاطر میں لانے والے تھے لیکن احتشام صاحب کی صلاحیت اور ان کی شخصیت نے جوش کو قابو میں کر لیا تھا۔ دونوں کے تعلقات میں استدراج کے ساتھ استواری آتی گئی۔ شخصیت اور فن کی شناخت میں جو عناد سر معاوان ثابت ہونے میں، احتشام صاحب نے انھیں نزہم کر لیا تھا اور وہ پکے پنج جوش پر ایک مستند ماخذ بن گئے تھے۔

تفقد کی دنیا میں اس طرح کے تعلقات کی استواری کبھی بڑی خطرہ کی نوبت ہوتی ہے۔ تفاوتِ عمر پر مبنی تعلقات کی استواری اسے سردارِ وح کے صاحبِ ناز کو بتی ہے۔ احتشام صاحب شریضِ نفس اور جوشِ قلب تھے۔ جوش کی نسبت بڑی جیدہ اور متفاد تھی اس کا تجربہ کسان نہیں کیا تھا۔ صاحب کی تنقید میں تعلقات کی استواری سرد راہ نہیں بنی۔ جوش سے ان کے ذاتی تعلقات کی سطح جو بھی رہی ہو۔ جوش کی شخصیت پر جب بھی انھوں نے قرار اٹھایا تو ایک بالینہ تفاوت کی حیثیت سے اٹھایا اس طرح "جوش شیعہ تھا تو انسان اور شاعر" صرف جوش کے انہام کو تقسیم میں معاوان نہیں ہوگی بلکہ احتشام صاحب کی بے لاگ تنقیدی بصیرت کا نمونہ ہیں کہ زندہ رہے گی۔

وہم تقیم

اکادمی احتشام صاحب کے وارثوں کا شکر بردار کرتی ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کا موقع اسے فراہم کیا۔ امید ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول حاصل ہوگا۔

محسود الہی

چیمبرمین
مجلس انتظامیہ

آر پریش اور دو اکادمی

قیصر باغ، کٹمنو

۱۲ اگست ۱۹۸۳ء

فہرست مضامین

- | | |
|-----|--------------------------|
| ۹ | دیباچہ |
| ۱۴ | ۱۔ ذہنی ارتقاء اور شخصیت |
| ۱۱۶ | ۲۔ نظریہ شاعری |
| ۱۳۷ | ۳۔ روانیت کا تجزیہ |

اپنے عزیز طلباء کے نام

دیباچہ

آپ جو شریع آبادی کی شاعرانہ عظمت اور فکری اہمیت کے قائل ہیں یاد ہوں لیکن اس کے تو آپ بھی انکار ذکر سکیں گے کہ آج کی اردو شاعری کا خیال آتے ہی جو ش کا نام سب سے پہلے ذہن میں ابھر آتا ہے اور کئی جہتوں سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کی عمر ساقد سال کی ہو چکی، ان کی شاعری کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام کو شائع ہوئے تھیں سال گزر چکے لیکن ابھی تک کسی نے ان کی شاعری پر لکھی توجہ نہیں کی اس بے اعتنائی کے اسباب کی چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں صالح اور مصلحانہ ناقدانہ بصیرت کا اتنا فقدان ہے جس سے ایسی اُمید وابستہ کرنا عبث ہے۔ کتاب تو خیر بڑی پیر ہے اب تک جو ش پر کوئی ایسا مضمون یا ناقدانہ تبصرہ بھی شائع نہیں ہوا ہے جس سے ان کی شاعری اور شخصیت کا واضح نقشہ نظروں کے سامنے آسکے یا ان کے خیالات کی بنیادوں پر روشنی پڑ سکے اس لیے میں نے اس موضوع پر مستلزم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ "جرأت" کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ایک زندہ شاعر جس کے دوست اور دشمن بھی خواہ اور بد خواہ پرستار اور منکر بھی موجود ہوں، نقاد کو بڑی ہڈی ہونے میں مبتلا کرتا ہے۔ اس پر انہی طرح نگاہ ڈالنے نہیں پاتی۔ اس کی شخصیت کے بعض پہلو اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ وہ سب سے پہلوؤں کے نظر انداز ہو جاتے

کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، شاعر سے واقفیت رکھنے والے اپنے علم و آگہی کی تصویر نقاد کی تحریروں میں ڈھونڈھنے لگتے ہیں، حاصلِ اندیشہ میں ہر قدم پر مصلحتوں کی جستجو کرتے اور نیت کا پتہ لگانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اگر سمجھنے والے میں اخلاقی جرات اور ادبی دیانت داری نہ ہو تو یہ خیالات اس کے قلم میں رنجیریں ڈال سکتے ہیں۔

مجھے بھی بہت سی دشواریوں کا اندازہ ہے جو شمعِ آباہی سے میرے تعلقات ہیں ان کے سہراہ ہونے کا خیال بھی مجھے آتا ہے انہوں نے ہندوستان سے پاکستان جاتے وقت جس غدر گناہ بدتر از گناہ حم کے خیالات کے مظاہرے کیے اور ان کا جواز ہندوستان اور پاکستان کے عوام اور خواہش کے ذہنوں پر مرتب ہوا اس سے ذمہ لکھیں پیدا ہونے کا فطری اندیشہ ہے، ان کے ترک وطن کو میں ایک بہت بڑی غلطی سمجھتا ہوں اور ان کے اس اقدام پر رنجیدہ بھی ہوں لیکن میں نے سہ کیا ہے کہ کوئی چیز میری راہ میں حائل نہ ہوگی اور میں ان کی شاعری اور شخصیت پر اسے دینے میں اس قدر جذباتی اندازِ نظر سے کام لوں گا جس پر مجھے اعتماد ہے۔ بعض اہم نقادوں کا خیال ہے کہ کسی شاعر کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ نقاد اس کی زندگی کے تمام اہم واقعات سے اچھی طرح واقف نہ ہو کیوں کہ شاعر کی روح اور شخصیت ہی کا عکس ہے روحِ شاعری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس لیے جو شخص سے میری واقفیت اُن کی شاعری اور اس کے اندازِ فکر کی ہمیں کھولنے میں مددگار ہو سکتی ہے اگر میرے سامنے کوئی ادبی نظریہ یا اصول تنقید نہ ہو تا تو البتہ یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا کہ میں شاعری کی زندگی اور اس کی شاعری میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں عیناً کی طرح کارِ اختیار کروں گا لیکن سماجی حقیقت پسندی کے ہم گیر اور ہمہ جہتی طریقہ تنقید پر عمل پیرا ہونے کے بعد زندگی یا شاعری کے کسی اہم پہلو کے نظریہ ازہر جاسے یا غلط طریقہ پر ایک دوسرے سے مطابقت کر دیے جانے کی غلطی

کا امکان مجھے کم نظر آتا ہے اس لیے خرم دعا ہی میں یہ بات ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ جوش یا جوش کی شاعری کا جذبہ باقی مضامین نہیں ہے بلکہ تنقیدی مطالعہ ہے جس میں مواد اور حقیقت کے ہر اہم پہلو سے بحث کی جائے گی جس میں خارجی اور داخلی اثرات اور کیفیات تجزیہ کیا جائے گا جس میں جوش کی زندگی اور دوسری شخصیت کو ایک زندہ اور متحرک سماج کے نشیب و فراز میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

جوش پر ایک مختصر کتاب لکھے گا خیال میرے دل میں پہلے پہل ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوا جب میں گھنواہی دہشتی میں اردو پڑھانے کے لیے مقرر ہوا۔ ایم اے کے نصاب میں جوش کا ایک مجموعہ ذکر، لٹریچر بھی شامل تھا۔ ہمارے طلباء ہر سوال کا سندھاٹ کا جواب دیتے ہیں، ہر مصنف پر نوٹ کے خواہاں ہوتے ہیں، میں طلباء کو نوٹ "گھنواہی غیر مفید ہی نہیں نقصان دہ بھی سمجھتا ہوں لیکن دستاویز یہ تھی کہ جوش پر تو کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی مقالہ ضروریں کا حوالہ دیا جاسکے اس لیے کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا اس خیال سے کاغذ پر خد ضروری اشارے لکھ لیے۔ ان اشاروں کی مدد سے انھیں کچھ لکھوا بھی دیا لیکن مجھے یہ بات کچھ اچھی معلوم نہیں ہوئی اور میں نے سوچا کہ ایک مختصر سی کتاب لکھ کر اس نشانی کو دور کروں یہ تھی ابتدائی تحریک۔

جوش اسی زمانے میں دہلی سے اپنا ادبی رسالہ کلیسم کے راجہ جلی آئے تھے، رسالہ بھی بند ہو چکا تھا کبھی کبھی لکھتے آتے تھے اسلئے بھی بند ہو چکا تھا کبھی کبھی لکھتے آتے تھے اور دیر تک ملاقاتیں رہتی تھیں، میں نے یہ خیال ان پر بھی ظاہر کر دیا تھا مقصد یہ تھا کہ ان کی زندگی کے حالات معلوم کروں اور نقاد کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری فرمنا انجام دوں۔ جوش نے کہا: اگر لکھنا چاہو تو مجھ پر اپنی کتاب لکھیے، میں نے کہا: "مجھ کو دوروں لیکن کیا آپ اپنی زندگی کے

وہ سارے دنیویں سرے سے مٹا کر رکھ دیں گے جن سے آپ نے اپنی زندگی
 زکیں بنائی ہے؟ ” محمدی سائنس بھوکہ دے ” ٹھیک کہتے ہیں آپ ہندوستان اور انگلستان میں
 براخون ہے یہاں تو اڑیاں چھڑ جائیں گی۔ اچھا! میں مرنے سے پہلے آپ کو کچھ نصیحتیں
 اور خطوط دوں گا اور اپنے اخطارہ (۱۸) عشقوں کے حالات سناتا
 گا میرے مرنے کے بعد ایسی ہی سوانح عمری لکھ دیجئے گا۔ ” بات گئی گزری ہو گئی
 ” دقت آخر ” وقت گزرتا گیا اور کتاب لکھنے کا خیال ارادے کی منزل سے آگے نہ بڑھا

سنہ ۱۹۱۷ء میں جوش نے اپنی طویل نظم ”حرب آخر“ شروع کر دی اور جس
 رفتار سے شروع کی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ دو دو چالی سال میں مکمل ہو جائے
 گی۔ میں نے سوچا یہ نظم ختم ہو جائے تو مکھوں کیوں کہ جوش اُن دنوں مکھوں ہی
 میں آکر رہنے لگے تھے اور جتنا حق بھی اُس نظم کا لکھ لیتے مجھے سننے کا موقع
 مل جاتا تھا کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس نظم کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو جوش
 کو مطالعہ کسی حد تک بغیر کل سارے گا گو اس میں کوئی ایسی نئی بات نہ تھی جس کا
 ادھر اور نقش جوش کی سنہ ۱۹۲۰ء تک کی شاعری میں نہ تھا ہو لیکن یہ کئی ہزار
 اشعار کی نظم اُن کے مرتب اور منظم خیالات کا آئینہ نقی اودان کے مطالعہ کو
 کسی قدر آسان بناقی تھی لیکن تین چار سال گزر گئے اور نظم مکمل نہ ہوئی
 پھر جوش شاید آراکچرز پہنچا چلے گئے اور ”حرب آخر“ کی رفتار اور
 سست ہو گئی۔

اسی درمیان میں ایک ایم۔ اے کے طالب علم کو ایک مقالہ اپنی نگرانی
 میں لکھوانا پڑا۔ عنوان تھا ”جوش بر حیثیت مفکر“ اس وقت پھر پرانا

ادارہ سلسلہ صفحہ گزشتہ

سے انگریزوں کے مشہور جواں مرگہ شعل کی سوانح عمری ہے۔ انھیں دنوں نئی نئی چھپ کر انگریزی
 میں یہاں آئی تھی۔ اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

خیال تازہ ہوا لیکن میری کاہلی کی نذر ہو گئی۔ جن طلباء کو معلوم تھا کہ میں جوش پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں وہ تقاضے کرتے رہے۔ جن دوستوں کو خبر تھی، لکھتے رہے۔ جن ناشرین کو پتہ چلا وہ اپنی خدمتیں پیش کرتے رہے لیکن بہت سے نیک ارادہوں کی طرح یہ ارادہ بھی ارادہ ہی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اشارہ پاکر میں نے کتاب شروع کر دی اور خیال تھا کہ چند مہینوں میں مکمل کروں گا لیکن جلد ہی حالات نے بے دلی اور بے عملی کی گود میں ڈال دیا۔ اور دوستوں کے اصرار کے باوجود میں نے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف ڈالے تو اب دس برس بعد انھیں پھر مکمل کرنے کی نیت سے اٹھایا ہے اور خطرات کے ڈٹے ہوئے تار جوڑے ہیں۔ اس وقت تک جوش کے متعلق جہاں کہیں جو کچھ لکھا گیا ہے میں نے تقریباً سب پڑھا ہے بہت سے بناؤں میں حقہ لیا ہے، اکثر اجاب سے تیار خیال کیا ہے، خود جوش سے بخشیں کی ہیں انھوں نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے سب کا بنور مطالعہ کیا ہے اس لیے جو کچھ لکھا ہے غور و سنسکر کے بعد لکھا ہے کتاب کی ترتیب وغیرہ کے متعلق چند جملے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں سوانح حیات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو حالات ہیں ان میں نہ تو اس سے زیادہ لکھنا ممکن تھا اور نہ وہ جوش کی شاعری کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، لیکن ذہنی ارتقاء پر ایک باب لکھ کر میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ان کی شخصیت کے برہنہ ہر مفقود پہلو میں سے وہ جتنے ڈھونڈ نکالوں جو ان کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں گویا اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک میں ان کے ذہنی ارتقاء اور شخصیت کا تذکرہ ہے جو ان کی شاعری کے مطالعہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے انکار و انعوارات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ابواب کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ جوش کی شاعری کا کوئی اہم پہلو چھوٹنے نہ پائے

دوسرے شعراء سے مقابلہ کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ حتی الامکان اس سے گریز کیا گیا ہے، کیونکہ اول تو کوئی مقابلہ مکمل نہیں ہوتا دوسرے اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ "حرف آخر" پر ایک الگ باب لگا کر منیمہ کے طور پر اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کہ ابھی وہ کتاب نہ تو مکمل ہے اور نہ جتنی ہے وہ سب کی سب شائع ہوئی ہے۔

جوش کا پہلا مجموعہ "روح ادب" ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا دوسرا مجموعہ "نقش و نگار" ۱۹۳۶ء میں نکلا، درمیان میں بعض مخصوص قسم کے مجموعے اور نظمیں الگ الگ بھی شائع ہوئیں لیکن سولہ سال کے وقفے میں جو ذخیرہ جمع ہو گیا تھا وہ ایک مجموعے میں کیسے سماتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غور سے ہی دلوں کا اندازہ کئی مجموعے نکل گئے، ان مجموعوں میں نظمیں نہ تو تاریخی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں اور نہ خود مجموعوں کی ترتیب تاریخی ہے مگر بہت سی نظموں میں تاریخ تحریر دے دی گئی ہے اس سے بڑی مدد مل جاتی ہے۔ جوش کی شاعری کا مطالعہ تاریخی طور پر بحاسب سے زیادہ قابل اعتبار ہے اور میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے، گو بہت سی قطعوں کی تاریخ معلوم ہونے کی وجہ سے تیجوں میں غلطی کا امکان بھی ہے۔

جوش کا مطالعہ ہندوستانی ادب کے ایک بہت اہم دور مطالعہ بھی ہے بد قسمتی ہوئی نسلوں کا مطالعہ ہے، تیرہویں صدی کا مطالعہ ہے اس لیے بعض سہا حث کو اس طرح پیش کرنا پڑا ہے کہ وہ بہ ظاہر موضوع سے الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا اسی غرض پیش کیا جانا ضروری تھا ورنہ جوش کی شاعری کے لیے ضروری اور مناسب پس منظر مہیا نہ ہو سکتا۔

ابتداءے شاعری میں جوش کے لیے لوگوں نے "مصور حذات" کا لقب استعمال کیا، کسی نے "شاعر فطرت" کہا، بعد میں "شاعر شباب" کے نام سے موسوم ہوئے پھر "شاعر انقلاب" اور "شاعر اعظم" کے لقب دیے۔

گئے۔ یہ القاب مناسب مہوں یا دہوں ان سے جوش کی شاعری کے
 آثار چراغوں کے اور خود جدید اردو شاعری کے مزاج کا کچھ اندازہ
 ہوتا ہے۔ میں نے ان باتوں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ اردو
 شاعری کے تدریجی ارتقاء میں جوش کی جگہ متعین کرنے میں آسانی ہو۔

اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش نہیں
 کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً جوش کی ذات یا شاعری پر کیے گئے ہیں لیکن
 ان کی شاعری کے متعلق متوازن نقطہ نظر قائم کرنے کے لیے یہ ضروری
 تھا کہ چند بنیادی مباحث پر تسلیم اٹھایا جائے۔ اتفاق ہے کہ کبھی کبھی
 وہی باتیں اعتراض اور کتہ چینی کے طور پر بھی پیش کی گئی ہیں اس
 لیے ضمیمہ ان کا ذکر آگیا ہے۔ جوش ترقی پسند ہیں یا نہیں، مزاج
 کے حامی ہیں یا کوئی نظام حیات چاہتے ہیں، اشتراکی ہیں یا نہیں،
 مشکک ہیں یا منکر، ان کے خیال اور عمل میں ہم آہنگی ہے یا نہیں، ان
 کی شاعری محض وقتی نعرہ بازی ہے، بحرانی پیچ پکار ہے یا فکر کے بروں
 پراڑتی ہے، وہ محض تصور پرست ہیں یا حقیقت پسند، ان کے پاس کوئی
 پیام ہے یا نہیں۔۔۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر اعتراض کی شکل میں سامنے
 نہ آئی ہوتیں تو بھی ایک استدلالی اور مفصل مطالعہ میں ان کا زیر بحث
 آنا ضروری تھا۔ خاص طور سے اعتراض کے الفاظ کو پیش نظر رکھ کر ان کی حمایت
 یا مخالفت نہیں کی گئی ہے بلکہ شاعری کے تجزیہ سے جو نتائج برآمد ہوئے
 ہیں ان کو اچھے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نتائج نکالنے میں جوش کے زبانی
 اقوال سے زیادہ ان کے تحریری خیالات سے مدد لی گئی ہے۔

جوش سے محبت کرنے والے بھی موجود ہیں اور نفرت کرنے والے
 بھی ایسے بھی ہیں جو افسوس اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں اور ایسے بھی جو
 سمجھتی ناظم سمجھتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کی رائیں بہت احتیاط سے تسلیم کیے

جمنے کے قابل ہیں۔ میں نے ان راویوں کو جو شش کی مکمل شخصیت اور شاعری کی روشنی میں پرکھا ہے اور کسی مخصوص نظر یا قول کی بنا پر ایک طرف فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس سے زیادہ ایک نقد کے بس میں کچھ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی راویوں کو جانچے اور انہیں صرف اُس وقت تسلیم کرے جب وہ اس کے مطابق کے نتائج سے مطابقت رکھتی ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس پہلے سے بنی بنائی موجود ہوں بلکہ مطابق کے دوران میں مخصوص علی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہوں۔

مثالیں اتنی ہی دی گئی ہیں جتنی کسی دلیل کے لیے ضروری تھیں حوالے دیے گئے ہیں جہاں میں نے کسی مصنف یا تصنیف سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں "روح ادب" کے علاوہ جو شش کی نام کتابوں کے پہلے ایڈیشن سے حوالے دیے گئے ہیں۔ "روح ادب" کا دوسرا ایڈیشن میرے پیش نظر تھا کہیں کہیں ایک خط کا حوالہ ہے اس کے لیے میں جناب جو شش کا شکریہ گزار ہوں کہ انہوں نے ایک بار میری استدلال پر چند سوالات کے جواب مجھے لکھ بھیجے تھے۔

ید احتشام حسین

لکھنؤ

۱۹۵۸ء

ذہنی ارتقاء اور شخصیت

انسان کے ذہنی ارتقاء اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو انفرادی یا اجتماعی قوتیں کام کرتی ہیں یا اس کے شعور پر جو خارجی اور داخلی اثرات اپنا پس و پیش ڈالتے ہیں اور جو مطلوبہ اور نفسیاتی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں ان سب کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے ہر قدم بڑی گتھیاں پڑتی جاتی ہیں اور انسان عقل اور روح کی وجہ سے عاطل اور معمول کے مدارج سے اس طرح گزر جاتا ہے کہ اس کے شعور کی گہرائی میں اثر کر اس کے اصل جذبات کا پتہ لگانا تقریباً محال ہو جاتا ہے لیکن ایک فرد کو لے کر اس کے پورے ماحول میں اس کا مطالعہ کرنے سے بہت صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں اس کا منازلہ و محال، حکمت و سکنات اور انگریزی اور اثر پذیری وغیرہ میں ایک ایسی انسانی خصوصیت پائی جاتی ہے جسے اس کے دوسرے اہلئے جنس کچھ تو اپنے بھر بے کی بنا پر اور کچھ علم کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں اس کے حرکات کے سوتے ڈھونڈنا اور اس کے خیالات کے ذخیرے تلاش کر سکتے ہیں، انسانی زندگی کے مطالعہ میں سب سے بڑی دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ انسان کی انفرادیت ایک فرد کی خواہشات اور خیالات کا منظر ہوتے ہوئے بھی سماجی حقائق کی سرزمین میں بنی اور نشوونما پاتی ہے اور مشین نہیں ہے بلکہ نہ تو غیر معمولی طاقتیں انتخاب و اختیار کی بڑی قوتیں رکھتا ہے ایک ایسی قوت ارادی کا مالک ہوتا ہے جو حیرت انگیز

کی کنکشن میں پرورش پا کر کبھی جذبات کے سحر کی جھلک میں پاش پاش ہو جاتی ہے اور کبھی بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتی اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس کی عظمت واقعات و حالات سے اثرے کر بدلتی رہتی ہے۔ اکثر تو مادی حالات اسے بناتے اور بگاڑتے ہیں لیکن کبھی کبھی صرف خیال و احساس بھی اس کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرنے میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ یہی نہیں بلکہ شاعر اور فن کار ہونے کی وجہ سے ان کے احساس اور اندازِ نظر میں جو خصوصیتیں عام انسانوں سے مختلف ہیں۔ چاہے وہ کیفیت میں یوں پاکت میں۔۔۔ ان کو جھنی لگا۔ سے ادھل نہ ہونے دینا چاہیے۔

شخصیت کی تعمیر میں داخل اور خارج جی، شعوری اور غیر شعوری عناصر کی کارفرمائی، جسمانی، انسانی، ذہنی اور آدنی تحریکات کی اثر اندازی یعنی بات ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان میں کسی کتاب کا اندازہ لگانا تقریباً محال ہے تمام چیزیں ایک دوسرے میں اس قدر گشتی ہوئی ہیں کہ ان کی قوت کا اندازہ الگ الگ لگانا دشوار ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے کچھ مواد تو پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ کچھ وقت اور ماحول فراہم کرتے جاتے ہیں، کچھ چیزیں ساتھ چھوڑ لی جاتی ہیں کچھ نئی داخل ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ فرد کا شعور تعمیر و تحریک میں آشربک ہو جاتا ہے۔ زمانے سے اثر قبول بھی کرتا ہے اور زمانے پر اپنے نقش بھی چھوڑتا ہے۔ اگر اس کا ذہن تجسس ہے تو دنیا جہاں تک پہنچا سکی ہے وہ اُس کا وارث بن جاتا ہے، اپنے علم اور شعور کی مدد سے، اپنی قوت انتخاب سے وہ اپنے لیے پسندیدہ راستہ تلاش کر لیتا ہے، جہاں تک اس وقت کی دنیا، اس وقت کے عقائد اس کو آٹھوگی پہنچتے ہیں وہ قانع رہتا ہے اور جہاں سے حالات اس کی خواہشوں اور خوابوں کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ غیالی طور پر یا عللاً دنیا کو بدل دینا چاہتا ہے۔ ایسے اس کے شعور اس کے رجحان اور اس کے فلسفہ حیات کا پرکھ ہو سکتی

بہت سے شعراء روایتاً شاعر کی کرتے ہیں دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں اور ذہنی طور پر اسی نظام زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں جنہیں ان کے سباہ و منزلہ اور منظر پیش روؤں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قائم کیا تھا ان پر غور کرنے کے لیے پس منظر، ماحول، فلسفہ، تغیر پر اتنا زور دینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جو شخص کی شاعری دیکھیں گے وہ ان کی زندگی کا آئینہ ان کی شخصیت کا عکس ان کے شعور کا عقلمانی حصہ ہے، ان کے مطالعے کے لیے ان خارجی اور داخلی محرکات کا سراغ لگانا ضروری ہے جو سوچنے والے دماغ پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

کسی شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے اصل توجہ کا مرکز شاعر کی ذات کو بننا چاہیے یا اس کی شاعری کو؟ یہ سوال مختلف شکلوں میں ہمیشہ نقادوں کے سامنے رہا ہے۔ پھر شاعری میں بھی کسی نے مواد کو اہمیت دی ہے کسی نے نے ہیئت اور انداز بیان کو، یہاں اس بحث کو اصولی حیثیت سے پیش کرنا ضروری نہیں صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جو شخص کی شاعری کا مطالعہ کرنے میں ان تینوں باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ شاعر اور اس کی شاعری میں جو تعلق ہے اس کا اعتراف خود جو شخص نے کیا ہے۔ حقیقی شاعر کی پہچان سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :

”تمام مشہور شعراء کی زندگی، فطرت، ہیئت اور عادات و اطوار کا غائر مطالعہ کیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کی ابتدائی زندگی کن مشاغل میں گزری ہے،

اس عہد کے اہم واقعات کیا ہیں؟ نیز سوسائٹی
 وطن، ہمسایوں کی ان کے کردار کے متعلق کیا
 رائے ہے؟ اور جب یہ تحقیقات مکمل ہو جائے
 تو ملک اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ فلاں سچا
 شاعر ہے اور فلاں جھوٹا۔

بدقسمتی سے ہمارے اکثر شعراء کے حالات اس طرح ہیں کہ وہ ان
 سے نقاب اٹھانا کئی جہتوں سے دشوار ہے۔ خود جوش کی زندگی تفصیل
 سے پیش نہیں کی جاسکتی لیکن وہ اہم واقعات جو ان کے کردار کی تشکیل
 اور تعمیر میں نمایاں حصہ لے چکے ہیں یا لیتے رہے ہیں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

(۲)

جوش افغان النسل ہیں۔ خاندان کی نسلی اور قومی خصوصیات آنے والی
 نسلوں پر مزور تصور بہت اثر ڈالتی ہیں لیکن آٹا نہیں کہ فرد کا مطالعہ
 اسی کی روشنی میں ممکن ہو سکے۔۔۔ اثر خون کی راہ سے بھی دہل جوتا ہے
 اور احساس کے پردوں کو چیر کر بھی ذہن پرانے نقش بناتا ہے۔ اس
 بات کو بار بار یاد کرنے اور ہرانے اس پر غور کرنے اور اس کی خصوصیات
 کو عزیز رکھنے سے صرف فرد ہی کی نہیں کبھی کبھی قوموں کی لغات میں
 خاموشی تغیر پیدا ہوتا ہے ایک انجانا احساس دل و دماغ پر پھیلا
 رہتا ہے جو دوسرے خیالات اور تصورات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتا
 ہے۔ خاندانی غامبوں اور خوبوں کا احساس نفس پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے
 اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں شدید ذہنی کشمکش پیش آتی ہے۔

جوش کو اپنے انقباضی ہونے کا خیال برابر آتا ہے، وہ اپنے آباد اجداد کے حب
سیف و ستم ہونے کا ذکر کرتے ہیں، ان کی امارت، ثروت، دولت، شکست
پرستانہ زندگی، ان کی سخاوت، غر بار پردی، شرافت اور شان سے
متاثر ہیں جن کی جھلک ان کی سیرت اور شاعری دونوں میں نظر آتی ہے۔

کابل سے بلا ہر اخبار کا علاقہ ہے وہاں کے ایک مہتمم جو آفسریڈی
یار بگ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا رخ کیا بصقہ
خنگ نے اپنی فوج میں ایک معزز جگہ دی۔ یار خنگ نے تلوار کی دھار پر
جل عزت اور ثروت حاصل کی۔ ان کے پوتے نیر محمد خاں گوتیا مختلف
جگہوں پر فوجی خدمتیں انجام دینے کے بعد غازی الدین حیدر تاجدار
اودھ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ان کے خاندان نے کنول اور ملج آباد میں
سکونت اختیار کر لی تھی۔ گوتیا تلوار اور مسلم دونوں کے دھنی تھے بہت
جلد حکومت اودھ کے دست باز بن گئے۔ اودھ کی حکومت
نے اپنے حدود کے اندر علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں
گوتیا کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ خود ناستخ کے شاگرد تھے لیکن دوسرے
شعراء سے بھی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ عربی فارسی کا
سفر ذوق رکھتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ عربی عربوں کے طرح
بولتے تھے۔ اس عہد کی شاعری کی جو خصوصیات ہیں وہ سب ان
کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ گوتیا کو اس لحاظ سے بھی تاریخ ادب میں
اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے "انوار سہلی" کا ایک ملخص ترجمہ
اردو شریں لستانے حکمت کے نام سے پیش کیا۔ مجموعہ کلام دیوان گوتیا
کے نام سے مشہور ہے اور یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

نیر محمد خاں گوتیا کے بیٹے محمد احمد خاں احمد جوش کے دادا بھی
شاعر تھے، ان کا نجم دیوان مخیر نے اکلام کے نام سے چھپ چکا ہے

بہت سی غصوبیاں ہیں وہ بھی گویا سے ملتے جلتے تھے لیکن نظامِ معاشرت بدل جانے اور اودھ کی سلطنت کی جگہ انگریزی حکومت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے ان کی زندگی کا رخ بدلا ہوا تھا۔ ان کا جنسی جذبہ بہت قوی تھا اس لیے اہل و عیال کی تعداد بھی کافی تھی۔ جوسٹس کے بڑے بھائی شیخ احمد خاں دلی نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی اولاد میں پچھتیس نفوس موجود تھے اور جوسٹس نے شروع ادب (جدید ایڈیشن) کے دیا ہے میں اپنے والد کا قول نقل کرتے ہوئے ان کے اولاد کی مجموعی تعداد ستو سے اور بتائی ہے صنفی نفسیات پر غور کرنے والے یہی کہیں گے کہ جسمانی طاقت کے اظہار کا موقع میدانِ جنگ میں ملا اس لیے اس نے شہوانی خواہشات کا جیس بدل لیا۔ جوسٹس بھی اپنے قوی میلانِ جنسی میں اپنے ہندگوں کے خون کی گرمی دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔

جوسٹس کے والد بشیر احمد خاں بشیر بھی جن کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے بہت کم اشعار کہے ہیں لیکن ان میں گویا ادراحد کے کلام سے زیادہ شگفتگی بے ساختگی اور اثر پائے جانے ہیں ان کے بڑے بیٹے شیخ احمد خاں دلی نے ان کے مختصر کلام کو ترتیب سے ۱۹۲۲ء میں کلامِ بشیر کے نام سے شائع کیا۔ مجموعہ کے شروع میں جملات لکھے ہیں ان سے بشیر احمد خاں کی علم دوستی، سخاوت، بہمان نوازی، بے تعصبی، وسیع النظری، مردت اور خوش اخلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی اور معاشرت کی یہ وہ قدریں ہیں جو اس وقت اور کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اس وقت بھی شرافت اور انسانیت کا طرہ امتیاز

کبھی جاتی ہیں اور جن کا نام لے کر متوسط طبقہ اپنے لیے ایک دنیا کی تخلیق کر لیتا ہے، ایک روایت بناتا ہے جس سے آنے والی بندوں کا ذہن حالات بدلنے کی صورت میں بھی بہت کچھ متاثر ہوتا رہتا ہے۔

یہ تھا ایک خوشحال، ذی عزت اور عظم دوست خاندان جس میں جوش سہلہ میں پیدا ہوئے۔ گھر میں مال و دولت نہ تو کچھ اور عشرت و فراغت کسی چیز کی کمی نہ تھی، بشیر احمد خان اپنے بچوں سے بہت محبت کرنے لگے، اس لیے ناز و محبت میں پلے۔ بچپن ہی سے زیادہ وقت لکھنؤ میں بسر ہوتا تھا جہاں دوست احباب اکٹھا ہو کر جوش کو ان کی ریاست اور امارت کا خیال ہر وقت دلایا کرتے تھے۔ نام بشیر حسن خاں رکھا گیا تھا اور سہلہ ان کا تخلص بھی بشیر ہی تھا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد بشیر سے جوش ہو گئے۔ عربی فارسی گھر پر پڑھی، فارسی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا پھر مرزا محمد ابدی رسوا صاحب امر اڑھان آباد کی محبت نے اس پر اثر چلا کر دی۔ مرزا رسوا جوش کے پرائیوٹ ٹیوٹر تھے جن سے متاثر ہونے کا اعتراف جوش خود کرتے ہیں۔ جہاں تک باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہے، جوش نے اس کی طرف خاص توجہ نہ کی۔ سینا پور

نے تخلص کی قبیلہ کے سلسلہ میں ایک دفعہ جوش نے مجھے بتایا کہ ابتدائے شباب میں نہیں بچپن کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ شہر میں ایک تھیر کیمنی آئی ہوئی تھی جہاں احباب کے ساتھ رات گئے کھیل دیکھ کر سب واپس آ رہے تھے۔ کچھ اس ایکٹرس کا تذکرہ تھا جن کے حسن سے سب متاثر تھا۔ کچھ شر و ستاعی کا چرچا تھا کہ مدد ان گفتگو میں کسی نے کہا کہ ہم لوگ برف جوش میں ہیں اس وقت بس نہ جانے کیسے اسی وقت یہ ملے ہو گیا کہ میرا تخلص اب بشیر کے بجائے جوش ہو جانا چاہیے۔ اس دن سے ہی تخلص ہو گیا۔

کھنڈ، علی گڑھ اور آگرہ کے مختلف سکولوں اور کالجوں میں داخل ہوتے رہے لیکن کہیں مقدم نہ جاسکے، اس کی وجہیں زیادہ تر جوش کے انفرادی رجحانِ طبیعت اور ماحول میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ کھنڈ کی تباہ حالی نے کھنڈ کے امراء اور رؤساء کے ذہنوں پر ایک غلامِ تسم کا بھونٹا اثر ڈالا تھا، ان کے دماغ میں امدت اور استمرافیت خاندانی اور آباؤ اجداد کی غفلت کا احساس اس قدر راج اور پس گیا تھا کہ وہ نئے حالات میں اپنی شخصیت کو ترقی دینے یا نمایاں کرنے کے ذرائع زیادہ نہ سوچ سکتے تھے، وہ بزرگوں کی غفلت سے اپنے تعلق کو کافی سمجھتے تھے اور اپنی ذات کی تلاش کے لیے ایسے مشغلے تلاش کرتے تھے جن تک عوام کی رسائی نہ تھی۔ جہاں تک تعلیم کے ذریعے شہرت اور عزت حاصل کرنے کا سوال ہے اس میں کھنڈ متوسط طبقہ کے لوگ اور عوام سبھی آگے بڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ امراء شاد و نادر ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔ یہ تو یہاں کی عام نصیحت تھی جو غیر شعوری طور پر رعیتوں اور رعیتوں زادوں پر اثر انداز ہو رہی تھی لیکن اگر ہم جوش کے اقتصادِ مزاج اور ذہنی ساخت کو کریدیں تو اور اسباب بھی ملیں گے۔ ان اسباب کا تجزیہ جستہ جستہ کرتے آئے گا۔

مختصر یہ ہے کہ جوش کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ سینئر کیمبرج کا امتحان دینے کے لیے سینڈ پیٹرس کانا آگرہ میں داخل ہو گئے تھے لیکن والد کے انتقال نے یہ بہم بھی سر نہ ہونے دی رسمی تعلیم کا یہ حال تھا لیکن جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے جوش نے مطالعہ کتب کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ بالکل ابتدا ہی سے دیندگی کے رموز اور فطرت کا اسرار سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ انسانی فکر

سب سے بڑی مسلم اور شاہدہ سب سے بڑی قیلم ہے۔ کبھی کبھی رکھی اور
 دیکھتے وقت شاہدہ کی بارہا ہلکے کڑکرتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نے ہنس
 میں ہجڑائی، گھبرائی اور دست پیدا ہوتی ہے۔ جوش نے بھی بچپن
 میں اپنی منکر ڈھچال کو اپنا رہنما بنایا اور خود اپنا راستہ ٹوٹل
 ٹوٹل کر چلنے لگے۔ انھیں ابتدائی کوششوں میں اس جوش کا سراغ
 بھی ملتا ہے جو اب بھی شاہدہ سے اور منکر کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے۔

جوش نے نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ یہ کوئی بڑی تعجب
 خیر بات نہیں، جوش کے گھر بڑے برابر شاعر رہتے تھے، مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا امتحان
 ہر مے بڑے شاعر جمع رہتے تھے، مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا امتحان
 ہوتا تھا، شاعرانہ جھلمکیں ہوتی تھیں، ادبی مباحثے ہوتے تھے، اور
 جوش کا شغف ذہن ان سے غذا پاتا تھا۔ جوش بہت سی دیکھیوں
 کے آدمی آج بھی نہیں ہیں، ابھی حال بچپن میں بھی تھا، تفکر بند ذہن
 کی یہ خصوصیت بچپن ہی میں نمایاں ہو جاتی ہے اور اکثر دہشتہ سید
 ذہن انقلابات کے باوجود باقی رہتی ہے۔ جوش کے پسندیدہ مشاغل
 کی فہرست نہ اس وقت لمبی چوڑی تھی نہ آج ہے، کتابوں کا مطالعہ،
 مناظر فطرت کا مطالعہ، نفس انسانی کا مطالعہ، دوستوں شاعروں
 اور ادیبوں کی صحبتیں، شاعری پس یہ تھے جوش کے مشاغل عمر کے
 تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں کی وجہ سے ان میں ایسے میلانات
 کا اضافہ بھی ہوتا رہا ہے جن کا ذکر مناسب مواقع پر آئے گا۔ انھوں
 نے اسے خود بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

— میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع
 کر لیا تھا۔ "شعر کہنا شروع کر دیا تھا"
 یہ بات میں نے خلافتِ واقعہ اور غلط فہمی کیوں
 کہ یہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے

شعری کے شعر اصل میں کہا نہیں جاتا، وہ تو اپنے
 آپ کو کہلواتا ہے۔ اس لیے صحیح
 طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہیے
 کہ غورس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے
 کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے دوست
 سمن نے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلنے
 تھے اس وقت کسی علیحدہ گوشے میں شعر مجھ سے
 اپنے کو کہلوا رہا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے
 کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں دھڑکھیلنے
 کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں۔

(روحِ اکتِ جوش)

یہ بحث تو بعد میں آئے گی کہ شعرا اپنے کو کہلواتا ہے یا انسان شر کہتا
 ہے یہاں انہی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ جوشس بکسین بسلام
 بچوں سے مختلف تھے اور یہ نتیجہ تھا ان کے منکری اور شاعرانہ میلان
 کا جس کو سنجیدگی سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے ابتداء میں شباب میں
 یہ سنجیدگی محبت کے تجربے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے چنانچہ جوش تعلیم نہ
 حاصل کرنے کا اصل سبب عشق و محبت ہی کو قرار دیتے ہیں۔

۵

میں لڑکپن میں جے عشق کمالات رہا
 علم حاصل ہوا کسی فکر میں دن رات رہا
 بھائی سے کام تھا مجھ کو نہ کسی ہم سے
 اڑکے کہتے تھے کہیں ہم نہیں کہیں ان سے

ادب میں وہی کیفیت کو بڑھتا ہی نہیں

سانے علم کا میدان ہے بڑھتا ہی نہیں

(روح ادب ص ۴۰)

وہ اس لیے نہیں پڑھ سکتے کہ آنکھوں میں کسی کی آنکھیں سما گئی ہیں ایسی
حالت میں

جوشِ تعلیم کیا، عشقِ جگہ و درجہ کیا!

مغفلِ علم کیا، جلوہ گہرہ کیا!

اسباب بوجھیں ہوں یہ حقیقت ہے کہ جوش اپنے رسمی مفہوم میں تعلیم کی

تکمیل نہ کر سکے۔ بخترِ نفس سے دل جسی لینے والے اس سلسلہ میں مرگنا یا

کریں گے اور غالباً یہ کہیں گے کہ چونکہ جوش نے باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کی

اس لیے اس احساسِ کمتری کو مٹانے کے لیے اپنی بوری اور بوجہ شاعری

کے فن میں کمال حاصل کرنے پر لگا دی۔ احساسِ کمتری کا یہ تصور اپنی

جگہ پر خود محبت کا محتاج ہے کیوں کہ یہ ساری انسانی جدوجہد کو،

ساری ارادی کوششوں کو ایک غیر شعوری احساس کا نتیجہ قرار دے

دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سماجی زندگی کی ایک منطق ہوتی ہے

اسی طرح خاندانی زندگی کی بھی۔ جس کی گرفت نکلنا مشکل ہوتا ہے پھر

اگر اور اسباب بھی بتایا ہو جائیں تو فرد کے انکار و افعال کو کھنچا آسان

نہیں رہ جاتا۔ اس لیے یہاں ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت

نہیں کہ انھوں نے باقاعدہ تعلیم کیوں نہیں حاصل کی۔ جوش کی سوانح

عری میں ان باتوں پر مفصل گفتگو ہو سکتی ہے یہاں تو ان کی زندگی

کے انہیں پہلوؤں کو دیکھنا ہے جن سے ان کے ذہنی ارتقار اور ان

کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔

جوش نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا ذکر کیا ہے

جس سے ان کے کردار اور شاعری پر کافی تیز روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

”شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو جی میں آتا تھا انہیں شباب درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میرا میز پر ایک چٹلا سا بید رکھا رہتا تھا اور بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا اسے میں بید سے اس طرح مارتا تھا کہ بچہ چارہ چمیں مار مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاغذوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر ڈرتا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا۔ اور میرے مزاج کی یہ وہی بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میرے سہلے کی درستی پر حینہ حینہ تنقید کرتا ہے۔“

(روحِ ادب ص ۱۹)

”صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، بچپن میں درس دینے کا مشغلہ بڑی عمر میں بھی رہا اور میری کی خواہش کا غماز ہے، بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ مسز پاتے تھے، آج جو لوگ جوش کی شاعری پر دھیان نہیں دیتے انھیں جوش اپنے مخصوص لمحات میں بہرا“

گزنہ، اندھا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ پید سے مارنے میں بھی گہرے نفسیاتی رمز ہیں جن میں سے بعض طنز و صاف گوئی، نازک مزاحیہ اور کئی حد تک آسریٹ انداد ہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ تہذیبی تعصبات اور فکری رجحان نے ان کی صورتیں بدل دی ہیں مگر نفسیاتی مطالعہ کی مدد سے انھیں پہچان لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ سماجی برتری کا احساس مختلف اوقات میں مختلف قسم کے بھیس بدلتا ہے اور جوش کے یہاں ان کی فراوانی ہے۔

(۲)

جوش کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں گو نظموں کو اچھا خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا لیکن جوش نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں تھیں وہاں غزل گویا آب و تاب حاصل تھی۔ لکھنؤ میں غزل گویا کئی ادوار سے گزری تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں کبھی سلی اور کبھی گہری جذباتیت اور رفت پسندی کا فروغ حاصل ہو رہا تھا جوش کی ابتدائی غزلوں میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی

لے مثلاً صدمہ کہ قدرت سے علاج نہ کم بہروں کو سنا ہے جا زنا زنا
انہ سوچے نہ فریاد نہ می رسد لے جوش آہ و سوز کنارہ ہر تو کی

اور بہت کچھ دیا اور نظموں

ہے۔ شرداع میں جوش کے والد نے انہیں شاعری سے روکا، ابھایا، بکھایا۔
 ناخوش ہوئے لیکن شاعری جوش کے لیے مشعلِ یادِ وقتِ گزاری نہ تھی بلکہ
 } شخصیت کا اظہار اور رُوح کی آواز تھی اس لیے کمی ہونے کے بجائے
 اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب باپ نے یہ دیکھا کہ اب اس آواز کو دبانے
 محال ہے تو نہ صرف شاعری کی اجازت دے دی بلکہ کھنوی کے
 مشہور شاعر مرزا محمد بادی عزیز کھنوی کے سپرد کر دیا۔ عزیز صرف فن
 شاعری اور زبان کے ماہر نہ تھے بلکہ اچھے جذبات نگار غزل گو تھے۔ ہیں
تقلین تھے جوش کو زبان و عرض کے نکات معلوم ہوئے ہوں تو معلوم ہوئے
 ہوں، فکر خیال کا کوئی مخصوص رخ ہاتھ نہ آیا۔ مجموعی طور پر ماحول اور
 زندگی کا دائرہ اثر وہی تھا۔ یہ قول جوش پر سنتے تلمذِ غائب ۱۹۱۳ء
 میں قائم ہوا اور چار پانچ سال قائم رہ کر منقطع ہو گیا۔ اس کی سب سے
 بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جوش نئی زندگی کے اثرات آہستہ آہستہ
 قبول کر رہے تھے اور عزیز اپنی ذہانت اور جوشِ طبع کے باوجود
 بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں طبع آباد
 میں سلیم پانی پتی کا قیام تھا وہ حالی کے بہرہ اور جدید ادب کے معماروں میں
 سے تھے انہوں نے جوش کی غزل گوئی کی تنگنائی سے نکل کر نظم کے
 وسیع سمندر میں کود پڑنے کی تلقین کی۔ جوش نے ایک خط میں مجھے لکھا
 ہے کہ سلیم صاحب نے غائب ۱۹۱۳ء میں یا اس سے کچھ پیشتر غزل

لکھ جوش نے ایک دفعہ بنایا کہ والدہ نے جاسوس مقرر کر دیے کہ میری شاعری کی
 خبریں انہیں پہونچائی جائیں چنانچہ داروغہ حامد علی اور غائب میں نام نظام کے سپرد یہ
 کام ہوا اور اس خبر رسائی کا صلہ فی خبر پانچ روپے مقرر ہوا داروغہ حامد نے اپنا آمدنی
 بڑھانے کے لیے جھوٹی خبریں پہونچانا شروع کر دیں۔ جہاں مجھے تنہا بیٹھا ہوا دیکھتے فوراً
 والدہ کو جا کر اطلاع دیتے کہ یہ جس خاں شرکمر رہے ہیں، انہیں پانچ روپے مل جاتے اور مجھے تنہا

گوئی پر فلک شکاف قہقہوں کے ساتھ مجھے نظم گوئی پر آمادہ کیا۔ اور انھیں کی فرمائش سے، چونکہ وہ محترم کا زمانہ تھا میں نے سب سے پہلی نظم ”ہلال محترم“ کے نام سے لکھی تھی جو تلف ہو چکی ہے۔ اس وقت تک جوش کے مطالعہ میں بعض فارسی کے اساتذہ مثلاً خاتم، عری نظیری، سعدی اور حافظ تھے اور اردو نثر و نظم میں دآغ، انیس، سرشار اور شتر کا جادو کام کر رہا تھا اور یہ جوش ہی دتھے جو ان اساتذہ سے متاثر تھے بلکہ اس عہد کے تمام پڑھے لکھے لوگ ان ادیبوں اور شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ ابھی تک نہ تو جوش کا مزاج معین تھا نہ طرز منکر لیکن طبعیت کا زور ایک طوفانی سیال مادے کی طرح آگے کی ہی طرف بہتا جلا جا رہا تھا اور فکر پسند مزاج کا، مہجان کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔ زندگی کے تجربے محدود تھے، نگاہ کی دست محدود تھی، پرواز کی طاقت محدود تھی، پس صورت کی چٹانیاں ہمیشہ کرتی رہتی تھیں اور وہ کاشادلیں میں کھٹکتا رہتا تھا جو ہر ذہین انسان کے دل میں کھٹک کر اُسے خلش کے دور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ ایک طرف خاندانی خصوصیات کا احساس دوسری طرف فکر کے تقاضے ان دونوں نے مل کر وہ کشمکش پیدا کر دی جس سے جوش پوری طرح کبھی باہر نہ نکل سکے۔

جب کہ مدت سے ہی میرا آبا ہے تو ہم
 صاحبِ سیفِ قلم ہوں تو کوئی اور ہیں

شاعری کیوں نہ کہس آئے مجھے یہ مرا فنِ خاندانی ہے

بڑی نود سے دنیا میں وہ بھر لے جو کارخانہ قدرت میں نہ کرنا ہے

اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جو شش لکھتے ہیں کہ :

مادی حیثیت سے وہ میری انتہائی فائزہ البانی
کا زمانہ تھا گھر میں دولت پائی کی طرح یہی
پہرتی تھی اور اس کے پوشش بدوش اقتدار
حکومت کا مظنہ بھی شامل حال تھا۔
 زندگی اور زندگی کی تلخوں سے قطعی ناواقفیت
 اور درد مند انسانیت کے شاہدے نیز
حیات کے تلخ تجربات سے کلینہ برکائی تھی۔
 البتہ ان تمام فائزہ البانیوں کے باوجود مجھے
 اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی شے رہ رہ کر میرے
 دل میں جھپکا کرتی تھی ، وہ "کوئی شے" تھی
 کیا ، مجھے اس کا مطلب کوئی علم نہیں تھا اور
 اس کے ساتھ ساتھ مجھے حسنِ مناظرے خوشی
 اور حسنِ انسانی سے دکھ محسوس ہوا کرتا تھا
 ایسا کیوں تھا ، یہ بات میرے دائرہ علم سے
 خارج تھی ۔

(روحِ ادب ص ۱۱)

جب دل ہر سوال مانگے ، جب چیزوں کی حقیقت جان لینے کی پراسا
 بے چین کرے اس وقت اگر خارجی دنیا کے حقائق ، اس کی کشمکش
 اور اس کی پیچیدگیاں ، نظامِ حیات کی سماجی گتھیاں اور محاشی
حدود نگاہ کے سامنے نہ ہوں انسان دراصل کیفیتوں میں پشاه
 لینا چاہتا ہے وہ خیال کی پردے سے حیات و کائنات کے راز سمجھ
 لینے کا آرزو مند ہوتا ہے اور ذہنی تسلی کے لیے کہی واپس گروا دیتی

حقائق کے بُت تراش کر انھیں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ بڑی بڑی باتوں کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اکھٹا اور انھیں کی نوک د بلکہ درست کر کے اُن سے اپنے ذہن کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ جانی پہچانی چیزوں میں ذہنی اطمینان کے پہلو تلاش کرتا ہے اور کبھی خالی دنیا بغیر کر لیتا ہے جو وقتی تسکین بخشی ہے۔ جوش نے اپنی نسک کی باگ مذہب کی طرف دڑ دی۔ جوش کے والد بشیر احمد خاں مرحوم کی خود مذہباً ادب اور مذہبی تدریج سے گہری محبت تھی اس لیے جوش کے اس رجحان کے لیے ایک سے زیادہ اسباب موجود تھے۔ جوش خود اس کیفیت کو کسی قدر وضاحت سے بیان کرتے ہیں اور چونکہ غور و نسک کے ذریعہ تغیر پسندی کا یہ جذبہ داخلیت کے حصار سے انھیں باہر کھینچ لایا اس لیے اس کا مطالعہ جوش کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے۔ لکھتے ہیں :

— نیز اس زمانے میں یادش بخیر، ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی کے ساتھ پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلانا اور کمرہ بند کر لیتا تھا اور گھنٹوں رکوع و سجود میں کھوپا ہوا رہتا تھا۔ اس دور میں میں نے دڑھی بھی رکھ لی تھی، چارپائی پر لیٹنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا تھا ایک مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین کے ہاتھ پرست بھی کر لی تھی۔ اور وہ چیز جسے مونیائے کرام "تجلیات" کہتے ہیں میرے قلب کو حاصل ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات میں میرے آنسو

راکھی

نکل آتے تھے اور ہاتھ میں گریہ نیم ہاشی اور آہ بھری کے
 وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سیرادل بہہ رہا اور
 میرا تمام وجود فضائے نیلگوں میں اڑ رہا ہے لیکن
 ان تمام باتوں کے باوجود دہشت و اضطراب کے
 ساتھ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے میرے
 دماغ کے اندر کوئی خطرناک کمان کھل رہا ہے
 جو آخر کار کھ سے میری اس دنیا کی لطافت
 کو چھین لے گی۔ چنانچہ وقت گزرتا گیا، کمان کھتی
 چل گئی اور کچھ مدت کے بعد مجھ میں ایک قسم کا
پکاپا غنا پیدا ہو گیا اور ترقی کرنے لگا
 اور آخر کار نسبت یہ پہنچی کہ میری نمازیں ترک
 ہو گئیں، داڑھی منڈ گئی، ٹکری نیم ہاشی اور آہ بھری
 کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور اب میں اس منزل میں
 آ گیا جہاں ہر قدیم اعتقاد اور ہر پارینہ روایت
 برا اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے اور اعتراضات
 بھی مسخر انگیز و اباست آئینہ

جب میرے خیالات و اقوال کا کارواں اس راستے
 پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا تو میرے رنج و محنت
 کو سخت اندیشہ ہوا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا انھوں
 نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھانا اور
 ایک مدت تک سمجھانے سے تنگ آکر آخر کار
 دھمکانا شروع کر دیا، مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں
 ہوا اور کبائی عقائد و روایات سے میری عادت

برہمچاری چلی گئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میرے باپ نے
 وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیج دیا کہ
 اب بھل میں اپنی "صند" پر قائم رہوں گا تو وہ
 اس وصیت نامے کو جس میں انھوں نے مجھے
 جائداد سے محروم کر کے میرے نام صرف سو روپیہ
 ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا تھا، "نچ" کے آہنی صندوق
 میں داخل کر کے میرے سنگھ کو زندان محرومی
 میں ہمیشہ کے واسطے مقفول فرما دیں گے۔

لیکن مجھ پر اس کا بھی مظن اثر نہیں ہوا اور
 وصیت نامہ اس کے دوسرے ہی دن لکھنؤ
 کے ڈسٹرکٹ "نچ" کے صندوق میں بند کر دیا گیا
 لیکن چھ ماہ کے بعد جس وقت کہ میں اپنے
 کمرے میں دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب
 دیکھ رہا تھا مانے مجھے جگایا اور کہا: "یاں
 بھارے ہیں" چنانچہ میں اپنے باپ کے پاس
 پہنچا سر جھکائے ہوئے اور اوب کے ساتھ۔
 میرے شفیع باپ نے مجھ سے کہا: "شیر!"
 اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا کہ بڑی بڑی
غلانی آنکھوں میں آنسو ڈھبائے ہوئے ہیں۔
 "یہ دیکھو دوسرا وصیت نامہ میں نے جائداد
 میں تمہارا حصہ تمہارے دونوں بھائیوں کے
 برابر کر دیا ہے۔" میرے باپ نے بھرتی ہوئی
 آواز میں مجھ سے کہا، مجھ پر باپ کی شفقت

اور اس وقت کی حالت کا یہ اثر پڑا کہ میری جھکیاں
 بندھ گئیں کہ اتنے میں میرے باپ کی آواز
 پھر گونجی "شیر اس دولت اور جائداد کی خاطر
 لوگ ماں باپ اور بھائی بہن تک کو مار ڈالتے
 ہیں یہاں تک کہ ایمان بھی گنوا دیتے ہیں مگر تم
 نے اس دولت اور جائداد کی اپنے اصول کے
 سامنے قدم برابر بھی برداشت نہیں کی، مجھے تمہاری
 یہ استواری و استقامت بہت پسند آئی، اگر
 تمہارا سا آدمی بھی ہو جائے تو بھی اس کی عزت
 کرنا چاہئے۔"

مجھ پر باپ کی اس حکیمانہ شفقت کا بہت اثر
 ہوا اور میرا دل باپ کے روبرو اور بھی جھک
 گیا، لیکن باغیانہ خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں
 ہوئی۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ میں اس موقع
 پر جس کو اپنے "باغیانہ خیالات" کا لقب دے
 رہا ہوں وہ اس وقت مذہب سے روگردانی
 اور الحاد نہیں تھا، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ
 نبی و عقائد اور بارگاہِ روایات کا طلسم باقی
 نہیں رہا تھا اور اس کی جگہ ایک دوسرا نہ ہونے
 والا میرا حاظ کر چکا تھا، جس کا ایک رخ تو
 میرے باپ کو بہت پسند تھا، لیکن دوسرے
 رخ کی شدت کو وہ نہایت غیر متحسن خیال نہ کرتے
 تھے۔ (روح ادب ص ۱۱۰-۱۱۱)

یہ طویل اتنی باس ضروری تھا کہ جو جس کا فطری اضطراب جس سانچے میں ڈھل رہا تھا اس کی اس سے واضح نقبور پیش نہیں جاسکتی۔ جس اس ننانے میں دنیا کی رہنمائی اور رہبری کرنے کے بجائے اپنے ہی لیے لنگر تلاش کرے تھے جس کی مدد سے خیالوں کے طوفان میں ٹھہر جائیں اور اپنے کا جذبہ دبا ہوا پڑا تھا، اپنے لیے راہ ڈھونڈ رہے تھے، جو کہ ملنے کی تلاش کی طرف سے فارغ ارباب تھے اس لیے وہ غل اور وجدانی قصورات کی جانب بڑھنا لگے کہ کیسوی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہی ادب کے مطالعہ کے سلسلہ میں آہائی عقائد اظہار حقیقہ اہلسنت کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے تھے لیکن جب تک وہ شکوک رفع نہ ہوں یا ان کی جگہ کوئی دوسرا عقیدہ پیدا ہو کر آسودگی نہ بخشنے اس وقت تک ان کا ذہن کسی طرح کیسوی حاصل کر سکتا تھا اس عہد کی ذہنی کشمکش کا مطالعہ کرنے سے جوش کے خلوص اور باغیانہ میلان کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے۔ خیالات میں اختلاف ہونے کی وجہ سے استاد سے بغاوت کی، غزل کی تنگ دامانی، الجدہ کرغزل گوئی سے بغاوت کی، آہائی عقائد اور یارینہ روایات کے طعن سے غیر آسودہ ہو کر ان عقائد و روایات سے بغاوت کی۔ پساکرنا درست تقاید نہیں تھا اس سے بحث نہیں جو نتائج نکلتے ہیں وہ اہم ہیں اور وہ نتائج ہیں ایک قسم کی منظرانہ کشادہ خیالی وجد باقی آسودگی کی تلاش، نئی باتوں کا خیر مقدم کرنے میں بے جھجک ہونا، ست برستی سے زیادہ بت شکنی کے جذبے کا نایاں ہونا۔

۱۹۱۶ء میں جوش کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جوش کی زندگی سچا تکدیک غیر متوقع موڑ پر آ گئی۔ ان کی ملاقات طبعیت

اور شاہانہ افتاد مزاج و زمنداری کے خوشوں سے کسی طمع و میل نہ کھا سکتے تھے۔ اعزاز و اداجاب کی نگاہیں بدل گئیں، نوکروں چاکروں کا انداز و نفاذ داری بدل گیا اور حب جوانی کی بادِ اسش میں شادی ہو گئی تو خانگی زندگی کے جھگڑے بھی سر پر آ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حساس طبیعت کو تفکر کے لیے نئی غذا باقیہ آگئی۔ گو اب بھی زندگی کی مادی کشمکش کی بھرپور چوٹ نہیں پڑتی تھی لیکن گرد و پیش جو تغیر ہو رہا تھا وہ بہت سبق آموز تھا۔ اعزاز کے سلوک انسانوں سے دل پھیرے دے رہے تھے۔ بچپن کی اتہائی پسندی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور رہبانیت کا جذبہ اس کی جگہ لے رہا تھا۔ کبیر، اس، ٹیگور، حافظ اور جہاں مطالعہ میں تھے دنیا بے ثبات معلوم ہو رہی تھی اور زندگی مادی آلائشوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ رہبانیت کا جذبہ شدت احساس میں داخل غائر کے تربیت دینے کا نتیجہ ہوتا ہے، اگر انسان خارجی حالات کا مقابلہ نہ کر سکے تو خوش مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادیت روحانیت کا خول ادڑھ کر آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ رواجِ ادب کی پہلی ہی نظم "توانستہ بیگانگت" اس کیفیت کی ترجمان ہے۔

مجھ کو ایسا ہے کہ جی بہت میں یہ تو نہیں دوست یا دشمن کوئی ہوا اس قدر طاعت نہیں
 حوصلہ اب آدمی کی خوشی یہ قدرت نہیں کیونکہ مجھ کو اہل دنیا سے کوئی حاجت نہیں
 دوسری دنیا میں ہوں دنیا سے میری جنگ ہے
 تاجِ ظاہری سے قدم بھی نہیں کروں تو ننگ ہے

زہر لگتی ہے ذہن کی مجھے آپ دیکھا ظاہری اسباب کو چھوڑے نہاں ہو گیا

مال و دولت اقربا احباب یار و آشنا جوٹ کھائی جب سے دل پر نیچے بیٹھا رہا
 غصہ وہ پردے میں ہے جس شخص کا پروانہ ہوں
 انتہا یہ ہے کہ اپنے سے بھی میں بیگانہ ہوں

لوح دل پر نقش تھا جب کہ یہ پہلی خیال دوستوں کو واقعی مجھ سے محبت ہے کہاں
 اقربا جذبات کو ہونے زدیں گے پا کہاں خواب میں بھی بھٹکے پہونچ گیا نہ ان کے کچھ ظالم
 ان پر میرا حق ہے میرا نہ ور ہے میرے پس یہ
 ہوں بُرے لیکن میرے حق میں بہت اچھے ہیں یہ

اس خیالِ غلام نے کیا کیا نہ کہ مجھ پر جفا میں سمجھتا تھا جنھیں سوطِ اہل مصفا
 جانتا تھا جن کو میں جانِ کرم دُور دُعا کہہ نہیں سکتا زبان سے کچھ انہوں نے کہا کیا
 کیا بتاؤں سختیاں کیں یا ذرا شفقت نہ کی
 غصہ یہ ہے مضائقِ نفس کی عزت نہ کی

اس نظم میں یہ مصرع بھی آتے ہیں ج، آدمی کی دوستی کا کچھ نہیں ہے اعتبار
 ع کہتے ہیں جس کو قرب دشمنی کا نام ہے ط آہ کہ یہ دم الفتِ یحبت تابکا،
 دنیا سے بیزاری اور بے ثباتی عالم کا احساس کوئی نئی چیز نہیں ہے،
 حساس دل معمولی ٹھوکریں کھا کر بیرونی، مادیائی اُمداد دیکھی قوتوں کی امداد
 چاہتا ہے انسانوں سے بھاگ کر فطرت میں پناہ لینا ہے اور اس کے ضرر
 پہلوؤں کو سراہتا ہے۔ ذہنی طور پر سکون حاصل ہو جاتا ہے لیکن جیسے
 ہی حقائق اور واقعات کی دنیا نئے سوالات پیدا کر دیتی ہے احساسِ ہمسر
 کو ٹپکتا ہے چنانچہ اس زمانے میں جو شخص نے بھی دنیا سے منھ موڑ کر دنیا

۴۰
ہے انتقام لینے کا ہتھ کر لیا۔ طے کیا کہ جٹ

سبزہ بیگانہ کے مانند رہنا چاہئے

اور جیسے ہی یہ فیصلہ کیا دل کی دہلیز بدل گئی۔

سائنس لی فیصلہ کرتے ہیں اطمینان سے ختم ہو گئے دنیا کے سادے مرحلے
دنیا پیدا ہوئے سینے میں آدھ دلوں سے مسکرایا میں زمین و آسمان کو دیکھ کے

آئی ہوئے دوستی فطرت کے سماں سے مجھے

لیجئے آئی اک مہک صحنِ گلستاں سے مجھے

کھل گیا دہناز سے آنے لگی ٹھنڈی ہوا سازِ غنچوں نے لئے گانے لگی ٹھنڈی ہوا
دوست کی خوشبو سے ترپانے لگی ٹھنڈی ہوا کیسوؤں میں مجھ کو ابھانے لگی ٹھنڈی ہوا

غیرِ خاطر کہ مرھبایا ہوا صفت کھیل گیا

دل مرا بچر کے اسس بیجا میر سے مل گیا

چھڑا کر ان کو میں فطرت کا شہد اب ہو گیا خوبی قسمت کو فوراً ربط پیدا ہو گیا
بیراہم سبزہ زار دکوہ و صحرا ہو گیا دوست میرا چہرہ و گلزار و محسوس ہو گیا

بچہ کہ حلقے میں تبسم نے یا خورشید کے

شامِ غم رخصت ہوئی جلوؤں میں صبحِ عید کے

دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی

جھوٹ سے واقف نہیں ہے ان رفیقوں پر مگر

اس دور کی شاعری انہیں خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ ایک خاص قسم
کا غم ہر وقت احاطہ کئے ہوئے معلوم ہوتا۔ خدا سے مل گئی ہے، اس کے دل میں اتر

آنے کا انتظار ہے، فطرت بہترین مونس معلوم ہوتی ہے اور زندگی کی لذتوں
سے جی اچاڑ ہے۔ ۱۹۱۳ء میں بلکہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے
درمیان جوش نے جو نظمیں لکھیں ان میں سے بعض کے عنوانت یہ ہیں
”گریر مسرت“۔ ”طوفان بے ثباتی“۔ ”انتظار کے آخر لمحے“۔
”دنیا میں آگ لگی ہے میرا دن بہترین خلوت ہے مناسب ہو
تو میرے دل ہی میں چلے آؤ“۔ ”سانس بویا خوشی رہو
مجھے تیری فستوں کی خواہش نہیں“۔ ”دنیا بے برق عرفاں
پا پناختی“۔ ”فلسفہ مسرت“۔

یہ ساری نظمیں صد فیصد اخلاقی عقائد سے معمور ہیں ان سے شاعر کے گداز
دل اور پرستارئی غم کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی اُس وقت کی زندگی
کو دیکھتے ہوئے یہ خیالات بالکل رکھی نہیں معلوم ہوتے کہ جذباتی ضرور
میں۔ مثال کے طور پر کہیں کہیں سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں :-

تاریخ اٹھا بتلائے گی وہ دنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دل پہ ہوس کا سکہ ہے اس تل کیلئے آدم نہیں
اس دل سے تعلق ہی جو چیز کہ جانے والی ہے
ہماں قییش جمع کئے جا موت بھی آنے والی ہے
ہمے تو ذرا بھی عقل ہو تجھ میں نام جہاں ہی کہ جانا
اللہ اگر توفیق تجھے دے موت سے پہلے مر جانا

عکس آئینہ کے اندر اُتر آیا چاہتا ہے
تو عنقریب دل میں آیا ہی چاہتا ہے

قسم اس درد کی جو ہجر کی راتوں میں اٹھتا ہے
قسم اس کرب کی جب روح کچھ کرب پر آتی ہے

۴۲
کہیے دنیا سراسر خواب اور خواب پریشاں ہے
نوحی آتی نہیں سینے میں جب تک سانس آتی ہے

بیرے انعام کی نہیں خواہش بلکہ مجھ کو تری ضرورت ہے

کس دہستہ گم شدہ کو جنگل میں ڈھونڈتا ہے
کس نیند میں ہے بندے! ہر سانس میں خدا ہے

سبت لیتا ہے اکثر معرفت کا فلسفہ ہم سے
کو ہم ڈوبے ہوئے ہیں جوش روحانی مسائل میں

انداز دادا سے اے دنیا تو لاکھ سنو کر سامنے آ
میر جوش فقر آزاد منش کب دھیان میں جھک کر لانا

بعض اوقات رسمی خیال آرائی سے زیادہ نہیں
سوتی لیکن ہم نے دیکھا کہ اس مخصوص زمانے میں ایسی صورتیں منہ اُرم
ہو گئی تھیں کہ جوشِ اکی میں پناہ لیں۔ ابھی تک دنیا اور دنیا کے مسائل
نے انھیں اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ خیالِ دنیا میں بستے تھے اور
صوفی بن جانے کے متمنی تھے۔ صوفیانہ اندازِ نظر کے دو پہلو ہوتے ہیں:
ایک تو دنیا سے دنیا سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کے جذبہ کا اظہار
دوسرے کائنات اور حیات کے راز جان لینے کی بے چین خواہش
کا اظہار۔

جو دھج عثر صوفی ہو جاتے ہیں ان میں دوسرا جذبہ یا تو ختم ہو جاتا ہے

یا میت کو اپنی ہی ذات میں سما جاتا ہے۔ جوشش گریہ سحری اور آہ نیم شبی کے
 کے باوجود علامتی درجہ کے، خود شناسی کی کوشش میں انہوں نے ماحول
 کو بھی متحرک کر لیا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ تنہا اپنی ذات کو مرکز بنا کر
 آسودہ کہیں رہ سکتے تھے۔ خاندانی زندگی میں انتشار تھا، پہل جنگ عظیم
 پھوڑی ہوئی تھی، جو لوگ اس کے اسباب اور حالات سے پردہ و آفتاب بھی
 درک کرتے تھے اس کے اثر سے محفوظ نہ تھے، دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ کسی دہائی
 جنگ میں جنگ کے دیوتا کو خراج دے رہا تھا جو سن نے نگاہ اٹھائی تو اپنے
 علاوہ اور لوگ بھی غلگن نظر آئے، کچھ جنگ کی تباہ کاری سے، کچھ قحط اور
 وبا کی تکلیف سے۔ ان کے شعائرہ احساس نے غائب پہل دفن اپنی نظم
 حالات حاضرہ (بہ زمانہ جنگ) میں واقعات تھے آنکھیں چاکیں اور کس
 کیا کہ یہ غم اُن کے ذاتی اور انفرادی غم سے بڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ

ہر چیز پر سکوت ہے، ہر شے پر یاس ہے

غم حکراں ہے دہریں دنیا اور اس ہے

کشتی رواں ہے زلیت کی دریا کے نہریں

بجلی تڑپ رہی ہے سرت کی لہریں

سلطان بڑھے ہیں دہریں لشکر بچے

اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لیے ہوئے

اب حد کے اختیار میں قسمت نہیں رہی

ڈاکہ رہا ہے رسم تجلوت نہیں رہی

خنجر سے غم کے رشتہ آرام کٹ گیا

قحط سے آشنی کے اندھیرا لپٹ گیا

سہتی کی ملکیت میں تباہی کلارا جا ہے

ہشیار ہو کہ فرقہ مصیبت پر تار ہے

محبت جنوں میں مری یاس سٹ گئی

دل یوں بٹا کہ قوتِ احساس مٹ گئی

درودِ قلوب میں ۱۳۰

اس نظم میں کئی قسم کی سیاسی شوجھ بوجھ نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک دھند
دل کی دو طرح کی تصویر کشائی دیتی ہے۔ ابتدائی دورِ شاعری میں ایسی نظمیں نہ
سولنے کے برابر ہیں اس کی وجہیں کچھ ایسی پیچیدہ ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں
آئیں۔ جو تن نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس وقت وہ سائل
حیات سے بے گناہ محض تھے اور یہ جو اتنا بھی زندہ گی کا تذکرہ آگیا ہے اس
کا سبب وہی کنس بند ادب سائل شفکار اندازِ منظر ہے جس کا تجزیہ
ادب پر کیا گیا ہے۔

اب تک جو سن کی شاعری کے ایک بہت ہی اہم اور بنیادی محرک کا
تذکرہ نہیں آیا ہے اور وہ محبت ہے۔ یہ کچھ اس لیے نہیں کہ اس کی
کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی ابتدائی شاعری میں اس کے
خطا و خال بہت واضح نہیں ہیں۔ کم سے کم ان کے پہلے عموماً رؤج
ادب میں جو عاشقانہ شاعری ہے اس کا تذکرہ باتور کی ہے یا اطحان
اور غیر جنسی۔ جو تن لکھتے ہیں کہ :

”یہی وہ زمانہ تھا کہ محبت کی تیز دھار میری

رگِ دل کو چھو کر رنگین ہو چکی تھی۔“

لیکن اس وقت محبت کے متعلق جو سن کے خیالات قدیم مونیانہ اور اخلاقی
تعلیمات سے متاثر تھے چاہتے خود کہتے ہیں کہ :

”میں محبت کو جنسیات سمجھنے پر تیار تھا

کھلائی چنے سمجھتا اور محبت کی تلخ شیرینوں

میں گم ہو جانے کو حیاتِ انسانی کا سب سے
بڑا کارنامہ خیال کرتا تھا۔

(ردِ ساحل ص ۱۱۱)

محبت کا یہ تصور ان کی غزلوں میں جاری و ساری ہے۔ اس میں جوانی کا انتہائی
کمی بچپن کی خصوصیت زیادہ ہے۔ ان کی نظم حقیقتِ دل سے ردِ ساحل
ص ۱۱۱ میں محبت کا سادہ اور پُر خلوص اعتراف ملتا ہے، غزلوں کے اشار
میں کہیں کہیں سچی محبتِ بھلی کی طرح چمک اٹھتی ہے اور جوانی کے روان
کی پُر خلوص جھلک دکھائی دیتی ہے جس میں ایک ناز مند نہیں ناز برداری
کے مثنوی عاشق کی تصور نظر آتی ہے۔ ابتدائی محبت کی یہ کامیابی جو شش کی
ساری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، اُن کے تصورِ عشق
و محبت کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے، ان کے یہاں احساسِ حسنہ
کیفِ نظر اور رسمِ محبت کی کہانی بالکل دوسری طرح کہی گئی ہے ابتدائی
محبت کی کامیابی کا تصور کرتے ہوئے جوش لکھتے ہیں:

— جی تو بیاختہ چاہتا ہے کہ میں اس ادب سے

وارداتِ محبت کو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے

تمام دیگر واقعاتِ زندگی کو اس دریا کے

درجہ کو دوں اور دنیا کو یہ بتا دوں کہ حسن کی زلفوں
کی کندوں نے کتنی بے پایاں نیاز مندوں کے
عید سے ناز کو گندہ کرنے کی سعادت حاصل

کی! لیکن دوتا ہوں کہ کہیں ان کی جبین ناز پر

ٹنگیوں نے خبر چائی۔ بہر حال مجھ ہی حیثیت سے

اس طرح پورے اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا

ہوں کہ میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت

جوانی کا انتہائی

اور عرفی کے اس شعر کا مصداق رہا ہے

آہنہا کہ آہوانِ حرم واکندہ صید

در آرزوئے ناکہ صید انگن من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں

اور سسینہ کو بیاں بہت بجا کم ہیں، کیونکہ یہ خبری

ناکای اور انفعالییت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں

ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔

(رُوحِ ادب ص ۱۴)

پھر مجھے ایک خط میں لکھا ہے :

۔۔۔ میری بیشتر عاتقانہ نظموں میں اُس چیز

کی 'لوگ کہتے ہیں' کی ہے جسے اکہ و فغان اور

سوز و گداز کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی

ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامراں پر میرے

اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ

عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف

بے بھرپور جواب دیا گیا ہے تو واضح رہے کہ

عاشق کا سیاق شے نہیں بہایا کرتا۔ اور جس

کا دعویٰ یہ رہا ہو کہ

آہنہا کہ آہوانِ حرم واکندہ صید

در آرزوئے ناکہ صید انگن من اند

اس کی جوتی کوئی اغرض پڑی ہے کہ وہ ناکای کے

آنسو بہائے۔ میں "ناکای" کے آنسو نگہ رہا ہوں

اس کا خیال رہے نہ نہ اشک و عشق کا جولی

ملامت کا ساتھ ہے۔۔۔

ان عشق ہائے کامراں اور ان کے اثرات پر کہیں اور تبصرہ ہو گا کیونکہ پہلی محبت کے علاوہ اور محبتوں کا تعلق اس دور کی شاعری سے نہیں معلوم ہوتا اور اگر ہے تو بہت ہلکا۔ پہلی محبت ایک انجانے بہان کی طرح آئی، تیز اور تند طوفان کی طرح آئی چونکہ محبت کی کامیابی یا ناکامی کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے ابتدائی شاعری میں اس کا بیان کسی انداز اختیار کر لینا ہے وہی آہ کا بے اثر ہونا، وہی نار و فریاد، وہی گشتی گھٹی سانسیں، وہی موت کی خواہش، وہی کوئے قافل کے پھیرے، وہی غم بھر کی لذتیں، وہی محبوب کے جھوٹے وعدے۔ ہاں کبھی کبھی اس کی انداز بیان میں ذاتی تجربوں کا بیان بھی ملتا ہے لیکن انھیں پوری قوت سے پیش کرنے کی صلاحیت سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد پیدا ہوئی۔ رُوحِ ادب کی اشاعت تک (یعنی سنہ ۱۹۲۰ء) جووش کی شخصیت اور شاعری میں ایک حد تک مضبوط نگاہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اس احساس کے باوجود کہ

اک فلسفے جدا جذبات کی ترتیب ہے غیر معمول عناصر سے مری ترتیب ہے
کسی غیر معمول قوت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، طاقت کا
خزانہ اندر چھپا بیٹھا تھا اور اس مٹھان کو جووش کھود نہ سکے تھے۔ لیکن
جن باتوں کا اظہار رُوحِ ادب کے سرسری مطالعے سے بھی ہو جاتا
ہے۔ ان پر پھر نگاہ ڈال لینا آئندہ مطالعہ کے لیے مفید ہو گا۔ جووش
روزِ حیات و کائنات کو سمجھنے کے صحیح یا غلط کوشش کر رہے تھے
تفکر اور تدبیر نے انھیں چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی عقل یا اپنے وجدان کی مدد سے
زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنا چاہتے تھے۔

تجربہ کے دشت سے دل کو غزرنے کے لیے

روزِ اک صورت نئی ہے خود کرنے کے لیے

غور سے دیکھا تو تمام دہر تو ثابت ہوا
آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لیے

ممنون ہوں طبیعتِ محنتِ شعار کا
ڈالا وہ آفتوں میں کائنات بنا دیا

ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن
گتوں کو اس جنوں نے بیکار کر دیا

دنیا کو سمجھنا، سمجھ کر عبرت حاصل کرنا، روحانی مسرت کی جستجو،
اسے پاکریا اس کا احساس کر کے لوگوں کو اس سے روشناس کرانا، لوگوں
کے اقوال اور اندر بھی صحیفوں کے کلمات کی گہرائیوں میں ڈوبنا، ان تمام
باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں تصورات کی بہتات ہے جن پر نظر رکھ
کر اکبر الہ آبادی نے جوشن کے متعلق یہ جملے لکھے تھے :

”حقائقِ عالم اور معرفتِ ماری تعالیٰ میں ان
کے اختلافِ نہایت پہنچ اور دلاویز ہوتے ہیں
آپ ایں دل بھی ہیں اور اہل زبان بھی۔ میری
خوش قسمتی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد
کرنے والے باقی رہیں۔ اس وقت آپ کی
طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازلی
برق برار رہا ہے جس کے لیے صرف شری کافی
نہیں آپ کو اپنی دستور کرنا چاہیے آپ بہت
کچھ ہو سکتے ہیں کہ شستن کیجئے کہ نماز میں لذت

طے اور علم باطن حاصل کیجئے کاشش کی وقت
میں آپ اور اقبال کیجا ہوتے۔ آپ کی صحبت
روحانی غذا ہے، عبرت، معرفت، بے خودی
جوشِ روحانی سے آپ کے اشعار بریزہوتے ہیں۔

جوشِ سنہ ۱۹۲۱ء میں شانتی نیکیتنے جا کر ٹیگور سے بھی مل چکے تھے۔
قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کر رہے تھے اس لیے اگر
ان کی شخصیت اور شاعری میں یہ پہلو نمایاں ہے تو کوئی تعجب کی بات
نہیں طبع آباد کی دنیا اور زمیندار خاندان کی فضا میں اس سے زیادہ ممکن تھا تاہم
جوش نے مطالعہ اور مشاہدہ کی مدد سے ایک اور دنیا بنالی تھی۔ اس منکری
اور فلسفیانہ رجحان کا اندازہ روحِ ادب کے نشریٰ مکڑوں اور اڑال
وکلمات کے مختصرے مجموعے مقالاتِ ذوقیہ سے ہوتا ہے جو اس
زمانے میں شائع ہوا تھا۔

اس کے علاوہ حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت سے بھی گہری وابستگی
معلوم ہوتی ہے۔ جوش کی فطرت پرستی پر دوسرے ابواب میں نظر
ڈالی جائے گی یہاں اس قدر بیان کرنا کافی ہو گا کہ جوش مناظر کے
حسنِ فطرت کی مصومیت اور کم آزاری سے متاثر تھے، فطرت کو
زندہ اور متحرک سمجھتے تھے اور اسی کے مطالعہ کے ذریعے حقیقت تک
پہنچنے کے خواہاں تھے۔ بالکل ابتدا میں صرف حسنِ فطرت کا تذکرہ
محتاج آگے بڑھ کر حسنِ انسانی بھی دل پر دھکرتا ہے اور روحانی محبت
کا احساس ہوتا ہے جسے وہ غیر جنسی اور مقدس بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔
جوش کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو سنہ ۱۹۲۱ء

تہ جوش نے مجھے خط میں لکھا ہے لیکن یہ سنہ ۱۹۲۱ء بھی ہو سکتا ہے۔

سے سلسلہ تک کا راز منظر آتا ہے اس زمانے میں رومانی اور عاشقانہ
 نظموں کی بھر مار ہے۔ محبوبہ و عاشق اپنے خود راز و نیاز کی سلسلہ جنابی
 کرتی ہے، محبت کی آگ میں جلتی ہے اور اپنے عاشق سے ملنے کے
 لیے نمازیں پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہے۔

میری پرکشش اور تیری بزمِ نیاز
 آئسہ میں اے شاہد عاشق نواز
 میں سرِ ابا خاک اور میرے لیے
 سلسلہ جنابی راز و نیاز

اک مرے دل کی تسلی کے لیے
 زلزلے میں آئے اور تمکین نواز
 یہ تزارِ رخ اور رنگِ خشکی

پر ترے ب اور حدیثِ سوز و ساز
 تیرا دامن اور دقِ اشکِ غم

بیراسینہ اور بارِ حریفِ راز
 جس کے قدموں پر ہو خمدِ قوتِ کاسر
 وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو ساز

عاشق نواز (نقشِ رنگارم ۱۲۵)

محبوبہ کے انتظار کی تکلیف کو شدید ہے لیکن جب
 رات بھگی گیتی ہے تو وہ وعدہ وفا کرتی ہے
 کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
 حسن دیکھو غریب خانے کا
 آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار

دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
 جمع سا ان ہے عیش و عشرت کا
 خون دل میں ضرب قسمت کا
 چشم بردارہ شوق کے بارے
 ماند کے انتظار میں تارے
 دفعتاً اک چٹک سی دوڑ گئی
 بام دور پر جھلک سی دوڑ گئی
 چپاگی بام و در پہ رعنائی
 دل میں لی دلوں نے انگریزائی
 نامہ قلمروں کے دم بدم کا پیے
 لڑکھڑائی زبان قدم کا پیے
 نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا
 رشتہ سٹامری نگاہوں کا
 آکے وہ اشک حقیم گئے بارے
 چاند نکلا سبک ہوئے تارے
 "چاند کے انتظار میں تارے"
 دفعتاً رنگار من ۱۳۰

نام و پیغام ہے محبت کی شدت میں افادہ ہوتا جاتا ہے شوق
 کی آگ جھڑکتی جاتی ہے 'روح گھبراتی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

دل کی بستی میں بچوں نہ ہو کہرام
 آہ یہ نامہ ہائے یہ پیغام

کاشکسی وہی وقت مجھے موت آجائے
 آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
 کاشکسی وہ یوں نہ با وفا ہوتی
 بانیِ ظلم ناروا ہوتی
 خفا کے ذرا نقش و نگار ص ۱۳۹

۱۹۲۳ء کی کئی نظمیں کامیاب محبت کی "اندازی" اور لذتِ کرب
 و شہداری کی آئینہ دار ہیں۔ بقول، اسے کیا کہتے ہیں، تخال غارتا
 سب میں یہی سازِ نثار ہے ہیں اور جب کچھ دنوں کے لیے جوشت
 چلے جاتے ہیں تو پہلی مفارقت دونوں دلوں میں کہرام مچا دیتی ہے
 جوشتِ بنگال میں کہتے ہیں :

اب اور وہ کی نسیمِ عقد کشا وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
 بادلوں کی طہرِ برکت میں آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
 ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا ہائے تیرا وہ چاند سا کھڑا
 کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جیسے کو
 تنگ ہے سانس آنے جانے سے اب بٹائے کسی بہانے سے
 پہلی مفارقت نقش و نگار ص ۱۴۲

اور مجھ کو پہلا بھیجتی ہے :

بند کو تری یاد نے ڈبویا سر جھائی ہوئی کلی ہوں گویا
 سہو ق ہوئی چھپا کے سب کو آپ ہٹتے نہیں چاند سے لگا ہیں
 چہرے یہ عیاں ہے دل کی انجمن ڈھیلے ہیں کھائیوں کے کنگن
 کتنا ہو کر آکر دس ہوئے تاب ایسے میں ابھی نہیں ہے شاداب

جلد ہر فردِ زنگ و بوہو قبل اس کے کہ خونِ آرزو سے
زرد کلیاں نقشِ دنگار ص ۱۳۵

یوں ہی محبت جوانی ہے خراجِ بستی رہی کایا ب ہر گز کشتا
میں مبتلا کرتی رہی خوشی اور غم کے طوفان اٹھتے رہے، محبت کی نادر
ساحل اور منجد ہمارے درمیان چپکے کھاتی رہی یہاں تک کہ محبت
”عقدہ لائیکل“ بن گئی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جوشس جس سماجی طبقے
سے وابستہ تھے اس کی شرمیت اخلاق کھلے بندوں محبت کی اجازت
دینے دیتی تھی۔ طبع آباد کار میں ابن ریس جس کی شادی بھی ہو چکی تھی اپنے
نیکو کی گلیوں میں محبت کے گیت گاتا نہیں پھر سکتا تھا۔ لیکن ایک
شاعر جس کی شخصیت تصور سے دونوں کے لیے محبت کا میں م کوڑ ہو گئی
ہو چپ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ جوش نے اپنے دل کی آواز شرواع میں
سند کی ۱۹۲۲ء میں ”عشق کامراں“ تھا ان کے مرتظرہ خون سے بہ خمد
اُبل رہا تھا:

محبت کامراں و شادیاں ہے
کھلا دقت فریاد و شیریں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال نجومبہ کی شادی ہو گئی اور آہِ بستان
میں بدل گئی، ”فریب قسمت“ کا خوف پورا ہو گیا۔ جوش نے لکھا:

کہ حشر ہے اے موت آ کہ غم سے لبوں پر اب جان آگئی ہے
وہ تیرے جو یادگار شب بھری ۱۲ سے بھی آندھی بھاری آ
دہائی حسنِ خجستہ خوکی کہ ہم عالم کی فتنہ حینسری
تھیں ہر دوں کو طار رہی ہے طے ہوؤں کو جہڑا رہی ہے

ادھر نیری کی مست لہریں بے ہوش ہیں پیام شادی
 ادھر نسیم بحر کی جنبش ترانہ غم سنار ہی ہے
 ادھر عر دسی لباس زر میں دکھ رہا ہے کسی کا کھڑا
 ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سناہ کفنی پہنا رہی ہے
 ادھر کیلجے میں سحر تھراتا ہے شعلہ مرگ ناگہانی
 ادھر شبناں زنگ دو میں جات ڈسکا رہی ہے
 ادھر عرق ہے مری جبیں پڑا دھر تھمکتی ہے جوشِ ایشا
 ادھر لبوں پر ہیں سرور آہیں ادھر جھاگنگنا رہی ہے
شادی دمرگ نقش و نگار ص ۱۵۲

محبت کا سیاب ہو کر بھی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے ایسی پیچیدگیاں
 جنہیں حل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نفسیات کے اعلیٰ ترین ماہر بھی
 خوشی اور غم کی اس عجیب و غریب آمیزش کا مکمل تجزیہ نہیں کر سکتے
 اُن کا بیان کرنا بھی آسان نہیں لیکن جوشِ کم سے کم اس کیفیت کے اظہار
 کی کوشش کرتے ہیں۔

دکھسِ غیرت ہے یا ادلیِ انبصار
 یہ فضا نہ نہیں حقیقت ہے
 دل میں ہیں جذبہ ہائے گونا گوں
 میرا فضا بدل بسیار
 شاعر ہی سے نہیں مجھے سروکار
 اکبھی جاتی ہے کا کل گفتار

مجھ کو وصل و فراق دونوں رسن
 عہدا خلاص توڑنے میں تنگ
 اُن سے ملے تو عافیت برباد
 مجھ کو تریاق و نہر، دونوں دار
 رشتہ شوق جوڑنے میں بھی عار
 اُن سے کھینچے تو زندگی بے کار

اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی ان کے پانے پہ بھی نہیں تیار
 کون کچھ لگا ان محمود کو عشق ہی مست عشق ہی ہشیار
 عشق ہی، بھر کے لیے بے چین عشق ہی اصل کے لیے بیزار
 عشق ہی راہِ کسی میں خفستہ عشق ہی بزمِ منکر میں بے دار

ایک طرف زابدوں کی مجلس میں میری غیبت کا گرم ہے بازار
 اک طرف عاتلوں کی محفل سے سخن ناردان کی ہے بوچھار
 دُفعِ اہل وطن، مصادِ اللہ تمہنوں کے لگا دیے استار
 سمت ہیں مجھ پہ کفر کے آمین نیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار
 اک طرف موت ایک جانب زمیت وہ بہت پہل، یہ بہت دشوار

محبت کی ڈور ہر قدم پر اکھٹی جاتی ہے شادیاں کے بعد محبوبہ وطن
 سے باہر چلی گئی، جوش دعا کرتے نظر آتے ہیں۔

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہونچا دے
 دوبارہ درِ عدن کو عدن میں پہونچا دے
 وطن کی روح کو جسمِ وطن میں داپس کر
 غزالِ شہتِ خشن کو خشن میں پہونچا دے
 وہ اپنے صں سے محفل میں اپنے عشق سے بزم
 اس الجھن کو پھر اس الجھن میں پہونچا دے
 نگارِ رفتہ۔ (نقشِ نگار ص ۱۴۱)

جوش کی زندگی میں ۱۹۲۲ء ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا
 ہے۔ اب تک جوش سیر و سفر کے لیے بارہا گھر سے باہر نکلے تھے لیکن

اب وہ سری حقیقت سے نکلنا پڑا۔ محبت کا جو پھندا گلے میں پڑا تھا وہ کبھی رہا تھا۔ وہ ہی کشاں کشاں انھیں حیدر آباد (دکن) لے گیا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ اعزاک بیگانہ دشمنی زمینداری کے کاموں کی اجتناب اور محبوبہ کی شادی کا زخم ملیج آباد چھوڑنے کے اسباب ہیں۔ لیکن ۱۹۲۵ء کی ایک منظم تہرے لیے اس راز کی نقاب کشائی کوئی ہے گھر چھوڑنے کے اور اسباب بھی ہیں لیکن اصل سبب مجھ سے ہے:

دھونڈتا پھرنا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
 پوچھتا پھرنا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے
 آہ گو اک عمر سے ہوں میں ریس بن ریس
 بن کے نکلا ہوں گدا سے بے نوا تیرے لیے
 مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
 شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صد تیرے لیے
 چار کر کے میں نے آباں امارت کا لباس
 زیب تن کی ہے غلامی کی تباہی تیرے لیے
 پھر میں آنکھیں مناظر سے ملے آباد کے
 لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے
 تیرے لیے (نقشہ نگار ص ۱۵۵)

نہ جس نے بوجھا تھا کہ زمینداری کے ہوتے ہوئے آپنے اتنی دُور جا کر ملازمت کیوں
 کیا جس کے جواب میں بکھا ہے کہ عاشق کا معاملہ تھا صاحب! سیکڑوں جاگیروں
 جاگیروں کے ہوتے ہوئے جس عاشق صاحب کو کرنا کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ تو اسی کے
 بغیر جس حیدر آباد میں قیام کیا جاسکتا تھا؟

اب محبوب کا سامنا بھی نہیں ہوتا، جس کی پر جھانپنا اور غور ہے
 میرا آتی ہیں اور "مطالعے التفات" کا مارا ہوا نشانہ "نور" سے غلام
 اپنے سینے سے تھمتا ہر کی تکلیفیں برداشت کلا ہے
 فریاد ہے اے خلوتی بردہ ناموس

کب سے ہوں تری دھن میں گریبان دریدہ
 واقف ہے کہ کس طرح بہر بہر مالش
 راتوں کو توڑتا ہے ترا زلف گزیدہ
 دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آج
 اے عمر بردہ! سایہ آہو کے رسیدہ!
 آتا ہوں ترے شہر میں پامال طاعت
 جاتا ہوں ترے شہر سے دشنام شنیدہ
 آؤ زونے محروم۔ (نقش و نگار ص ۱۷۹)

اگر ہمیں تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، غصے کے ہکا دنوں کے اندر
 جوش کو یہ احساس ہو گیا کہ محبوب کو اب ان سے محبت ہی نہ رہی۔

نا قابلِ تسخیر، کون نے کیا؟ آتے نہیں جو تم، اداس صبح، خبر ہے کہ
 نہیں؟ یہ تمام نظمیں سنہ ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی ہیں اور ان تمام نظموں میں
 یہی خیال مرکزی جگہ رکھتا ہے مثلاً:

ہر نفسیں ترک و فاجر اُسے تو بیخ زک
 قید ہوتی ہے کہیں بوئے چین موجب ہجر
 پوچھے اس دن کو کہ جس نے اُسے رام کیا
 اس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کیا

اے یارِ دل نشیں وہ ادا کون لے گیا،
 تیرے نگیں کے نقشِ وفا کون لے گیا؟
 لے شاہِ بندہ پر درِ سلطانِ نرم دل
 دل سے ترے خیالِ گدا کون لے گیا؟
 راتوں کو مانگنا تھا دِعا میری دید کی
 وہ ضعیف وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟

میرے پیامبر کے اٹھاتے تھے پہلے ناز
 اب میرے دل کے ناز اٹھاتے نہیں ہو تم
 آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اسی طرح
 لیکن نظرِ بجا کے اب آتے نہیں ہو تم
 یک لخت تم نے جوشِ کورل سے ٹھلادیا
 اور اس میں صید کیا ہے؟ بتاتے نہ ہو تم

لے صبا! کوچہ جاناں میں گزر رہے کہ نہیں؟
 تجھے کو اس فتنہِ عالم کی خبر ہے کہ نہیں؟
 اب مرے نام کا بڑھتا ہے ظہق کون؟
 اب مرا ذکر و ثناء اور سحر ہے کہ نہیں؟

اور یہ چیز بڑھتے بڑھتے سکلی یا س اور کدو کے رگ میں تبدیل ہو گئی۔
 ایسی بے دلی پیدا ہوئی کہ جب محبوب نے "اعادہ یہاں" کرنا چاہا
 تو جو سخت کی زبان سے یہاں تک نکل گیا:
 { ہم ہی نہیں ہے جوش میں تجدیدِ عشق کا احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے }

یہ ساری منزلیں کسی سال کے وقفے میں آئیں۔ پس دریاں میں جوش کا احوال چھا خاما
 بدل گیا تھا۔ آبداد اور کھنڈ۔ — جھوڑے کا انیس جو غم تھا وہ
 ان کی نظم الوداع سے ظاہر ہے ہر چھوٹی بڑی چیز دامن تمام رہی
 تھی، رنگین گلستان، سرزمین خداں، "فیض محراب جوش کے مکان کا
 نام ہے) خوشی، کھلے میدان، آم کے باغ، دست کوئل کی آواز، بولوں کی
 جھاڑ، چاندنی راتیں، سب سے رخصت ہونا چاہئے ہیں۔ اس نظم
 میں یاد جوش نے ٹپکا آباد جھوڑے کا اصل سبب چھپایا ہے یا سبب
 "نکروردگار" بھی ایک بڑی وجہ تھی کیونکہ "منکر دنیا" اور "نکروردگار"
 کا ذکر بار بار آیا ہے۔

گھر سے بے گھر کر رہی آہ منکروردگار سرنگوں سے فرط غیرت سے اب جد کا قہار
 خلعت ماضی ہے جسم زندگی پر تازہ تار پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی الذلت کا آثار
 شمع خلوت میں ہے روشن تیرگی مغل میں ہے
 رخ پر گرد بے کسی شان ریاست تل میں ہے
 آہ لے آہ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار مٹ کے رہتی ہے ترے جو رخسار ہر بہار
 نوح انسان کو نہیں تیری ہوئی سازگار فکر دینا اور شاہ عزت ہے لے لیل دنہار
 موبہ کو خرد قف ہوا و نشہ کامی کے لیے
خوابگی رخت سفر باندھے غلامی کے لیے
 اور آج انقض و نگار میں ۱۱۰

لیکن باہر نکلنا جوش کے لیے مفید ہوا۔ حیدر آباد میں وہ دارالترجمہ میں
 "ناظر ادب" ہو گئے۔ زندگی کی کشمکش نے نئی صورتیں دکھائیں۔ گھر سے
 دور ہونے کی وجہ سے دل میں نئے انداز کا گہرا پیدہ ہوا۔ صمیمیت بدلتی
 ہجرا و دنیا کامی کے فشر جیسے 'نئے' تجربوں کے مواقع ملنے آئے۔ آقائی سے غلامی

کی منزل میں قدم رکھنا پڑا۔ شور کی دنیا بدلی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک
 ہندوستان میں انقلاب کی زبردست آندھیاں چلی تھیں۔ جنکو فتح اکثر
 نو جوانوں کو ان کے رنگ محل اور بہتر عشرت سے اٹھا کر جدوجہد کے خاندان
 میں لا کھڑا کیا تھا لیکن ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ، احساس
 شاعر کی آنکھیں اپنی ہی ذات پر اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ اس نے اس
 طوفان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ لیکن حیدر آباد کی ریاستی فضا میں آزادی
 اور غلامی کی کشمکش کے نئے تجربے ہوئے۔ جس کی ناز برداری مجھ بہ نئے کی
 تھی۔ جس کے گرد و پیش ہوا خواہوں اور مصاحبت کا فرض انجام دینے والے
 دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ وطن سے دُور مزدوری کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔
 اس انقلاب کے داخلی احساس کی شہادتیں جوئی کے کلام میں ملتی
 ہیں اور یہی احساس ہے جو نئے حالات کا عطیہ تھا، یہی احساس تھا جس
 نے اُن کی منکر و منظر کی دنیا وسیع کی۔ طبع آباد، لکھنؤ، اپنی ذات،
 خاندان، دقار، اعزاز کی بے اعتنائی اور مجھ بہ کے جوہر التفات سے ہٹ
 کر نگاہیں "دور انگیز کھلونے" اور "ٹھنڈی انگلیوں" پر بھی پڑیں۔

یہ زمانہ جوئی کے ارتقاء ذہن کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا
 ہے۔ کچھ اپنے کام کے سلسلہ میں اور کچھ اپنے ذوقِ نفسی کی نیکی
 کے لیے جوئی کے مطالعہ کتب کی رفتار بڑھ گئی۔ اب تک جوئی نے
 عام طور سے شروادب کے مطالعہ میں وقت صرف کیا تھا اب کتابیں
 پڑھیں تھیں، اردو مافی قصبے کہانی اور افسانے دیکھے تھے، اب تاریخ،
 فلسفہ، اخلاقیات اور دوسرے علوم و معون کی کتابیں دیکھنے کے مواقع
 ملتے آئے، دارالترجمہ کے اعلیٰ معلم یا نستہ مستہ حسین سے تبادلہ خیال
 کا سلسلہ شروع ہوا۔ شروع میں حافظہ، قیام، کبیر و آس، شہزاد
 سرشار، داغ اور انیس کا اثر تھا اب اس میں موتس، غالب اور نظیر

اکبر آبادی، بھی شامل ہو گئے، شیگور اور اقبال نے مٹا ڈیا۔ جو شخص اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

ابستدا میں سترہ سترہ کی نشر اور اف
دستیس کی شاطری سے مٹا ہوا آگے بڑھا
تو سمن، میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی نے
مٹا ڈیا، پھر شیگوریت نے دل میں گھر کیا،
اس کے بعد اقبال آئے لیکن چھاپہ نہیں سکے، پھر
درد و سوز کو بڑھا اور اثر قبول کیا۔ پھر گوشت
نقشے، میکم گور کی سبیل، وکٹر ہوگو، برگساں
سٹونجہاؤز اور کارل مارکس نے مٹا ڈیا۔ فارسی
میں سعدی، خیام، نظری، عرقی، اور سب
زیادہ حافظ نے دل پر اثر کیا، جواب تک ہے
اور ہمیشہ رہے گا۔ ہندی میں تسی، داس اور
سے مٹا ڈیا ہوا

ظاہر ہے کہ اس میں آج تک کے اثرات شامل ہیں اور ہر طرح کے
بعض صورتوں میں تو یہ اثرات ایک دوسرے کی ضد پیش کرتے ہیں لیکن
اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان یوں ہی متضاد خیالات اور اثرات کو قبول
کرتا، چننا، ملگ کرنا، پسند کرتا اور چھوڑنا آگے بڑھ جاتا ہے۔ زندگی کے بہاؤ
میں بہت سی چیزیں ساتھ ہو جاتی ہیں کچھ دُور تک ملتی رہتی ہیں کچھ ہلکا سا اثر
ڈال کر الگ ہو جاتی ہیں انسان کمزور جذبہ بانی لکھوں میں بعض باتوں کا اثر
قبول کر لیتا ہے جب غور کرتا ہے تو انھیں ترک کر دیتا ہے کبھی ترک کرتے
ہوئے اسے دکھ ہوتا ہے اور خامیوں کو جاننے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتا،
ہر انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہر لمحہ وہ مخصوص اصولوں ہی کے تحت سوچے

اور عمل کرے زندگی بہت سے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جہاں اپنے پسندیدہ نظریات کے خلاف بھی کہنا اور کرنا پڑتا ہے لیکن ان باتوں کے باوجود فرد کی شخصیت میں یکسر پراگندگی نہیں ہوتی۔ حیات و کائنات پر غور کرنے والے زندگی کے موٹے موٹے اصول تلاش کر لیتے ہیں جن کی مدد سے وہ ہر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح ان کے انداز منکر اور طریق کار کا ایک راستہ بن جاتا ہے جو ان کے کردار اور ذہن کا مظہر ہوتا ہے۔ خیالات و افکار کے طوفان و اوجات اور حادثات کے عمل اور رد عمل سے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے جس میں تضاد کی رنگارنگی ماند ہو جاتی ہے اور ایک مخصوص قسم کی یک رنگی کا ظہور ہوتا ہے، غور سے دیکھنے اور کریدنے سے دبے ہوئے رنگ بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جوش کی شخصیت میں ان تضاد عناصر کا ڈھونڈنا مکان مشکل نہ ہو گا جو مختلف خیالات و بیوں اور مفکروں کے مطالعہ کا نتیجہ ہو سکتے ہیں لیکن جس وقت ہم ان کے ذہنی ارتقار کے متعلق تفصیل کرنے لگیں گے اس وقت یہ پتہ آسانی سے چل جائے گا کہ کس قسم کے اثرات نے ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔

مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کی قوت بھی بڑھی اور منکر میں گہرائی آئی، انفرادیت پر سماجی حقیقت کا ہلکا سا رنگ چڑھا۔ حیدر آباد کے ریاستی اور پبلک اسکولوں میں زندگی کے نشیب و فراز زیادہ دکھائی دیے۔ مناظر فطرت سے وابستگی جاری رہی، ملیح آباد کی ابتدائی زندگی میں شراب کا ذکر نہ تھا اور اگر تھا تو حافظ و خیام کے انڑے سے

لیکن اب شراب کا ذکر ایک سٹفل موضوع بن گیا۔ ۱۹۲۲ء میں کہا تھا:

ترک کروں گا شعل سے نا صبح
ہاں سر آنکھوں پہ آپ کا ارشاد

۱۹۲۴ء میں :

کشتی کے کواے خدا کے ضیوع
 بخش دے قمرت سفینہ نوح
 چشمہ زندگی ہو مدح سرا
 ارغوانی شراب ہو ممدوح
 بادہ ہے اس طرف ادھر کو ٹوڑ
 اس کو فاتح بنا اُسے مفتوح
 آہ آئے نہ مے پر اُسے معبود
 تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

اور حیدر آباد کے قیام میں چند جڑے اور پیام کیف کی پیش
 کن نظمیں لکھیں۔ اسی زمانے میں جوش نے شعروادب کے متعلق اپنی
 اپنے خیالات ظاہر کیے جس میں تصور پرست اور عینیت پسند مفکروں
 کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر طہیم عیب اور تلمیذ رحمانی نقا جس
 کے شعر حد اور اک تک دوسروں کی رسائی نہ تھی۔ اس کا تجزیہ کسی اور
 مقام پر کیا جائے گا۔

حساس انسان بہت جلد اثر قبول کرتا ہے، بہت جلد خوش ہوتا ہے
 بہت جلد بخیدہ لیکن جو احساس شدید ہوتا ہے وہ دیر تک قائم
 رہتا ہے کبھی کبھی اس سے بھی تضاد کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں
 یہ تضاد خیال اور عمل کے اثرات کی شکل
 میں زیادہ موثر طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں جنون و خود
 کی جو کشمکش ہے وہ بھی اس کی منظر ہے وہ پہلے ہی سے تقدیر
ادشیت کے کسی قدر قائل تھے لیکن انسان کو مجبور بعض نہ سمجھتے تھے

تم سے چھڑا رہا ہے زمانہ بیمار میں
کیا داخل ہے مشیت پروردگار میں

جو مفرد میں ہے وہ جو کے رہے گا اسے جوش
آپ کیوں دل کو پریشان کے بیٹھے ہیں

لیکن یہ خیال اتنا عام ہے کہ اس کو جوش ہی سے مخصوص کرنا یا ان کے کردار پر اس کے عمل کی جستجو کرنا بے سود ہوگا۔ بعد کی شاعری میں جبر کا تذکرہ اتنا ہے کہ اس کی ابتدا کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جوش نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ انسان کی مجبوریوں کی جانب انھیں سب سے پہلے فانی بدایونی نے متوجہ کیا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی، لیکن بات اتنی ہی نہیں نہیں ہو سکتی۔ جوش کے داخلی انداز فکر میں اس کے لیے پہلے سے وجہ تجاوز موجود تھی۔ ان کے یہاں اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں کہ وہ جبر کو تسلیم کر کے آزاد ہو جائیں۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے جو اس کے اعمال و افعال کو حق پر جانب ثابت کرے جس سے اُسے منیر کی سرزنش سے چھٹکارا مل جائے۔

جوش آزاد خیالی کی طرف ضرور مائل تھے لیکن اس وقت تک نہ ہی نظام اخلاق کو ٹھکرانے کی جرات دے رکھتے تھے، ذہن کی اس دوائی کے لیے جبر ہی میں جلے فراغت تھی۔ اگر گناہ کو گناہ، بُرائی کو بُرائی نہ کہتے ہوتے تو بدی کو بھلی ہوتی نیکی، اور گناہ کو "معلوم بُرائی" انسان "ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتے، یہی کوشش اس جو

کی غماز ہے جو ان کی روح میں چھپا بیٹھا تھا۔ آزاد خیال انسان کو اس کی منکر باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ شراب نوشی کے جواز میں نہ اسی کتابوں سے حملے پیش کرے، لیکن جوشن ایسا کرتے ہیں۔ خیر یہ بحث یہاں طوالت پیدا کرے گی، ذہن نشین صرف یہ کرنا ہے کہ خیال اور عمل کی دوئی یہ جھیس بھی بدلتی ہے اور فلسفہ کی حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا جائے تو فکر و نظر کا سارا انداز اس سے متاثر ہوتا ہے۔ جوشن نے بھی صرف فاتی کے متوجہ کرنے سے نہیں بلکہ اپنی منکر کو ایک فلسفیانہ بنیاد دینے کے لیے جبر کے عقیدے کو تسلیم کر لیا۔

حیدر آبادی کے دوران قیام میں جوشن نے ہیکل (TAECKEL) کی مشہور کتاب THE RIDDLE OF UNIVERSE (جڑی جو خدا اور مذہب کی طرف سے منکر کہ جانے میں ایسا تانی نہیں کہتی۔ جدید انھوں نے RATIONALIST PRESS کی کتابیں بھی پڑھیں جن میں والیٹر کے مضامین MAC CADE کی JOSEPH EXISTENCE GRANT ALLEN اور THE EXISTENCE OF GOD کی THE VOLON OF THE IDEA OF GOD کو خاص پسند کیا۔ یہ کتابیں کسی مختصر فلسفہ حیات تک نہیں پہنچا میں لیکن آزاد خیال ضرور بناتی ہیں۔ جوشن کے یہاں بھی یہی ہوا۔ انھیں مذہب کے دعوؤں اور حد بندیوں کا مذاق اڑانے میں مڑانے لگا۔ ایسے مواقع پر طنز کا حربہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے، جوشن نے بھی اس اس سے کام لینا شروع کیا، سو لوگوں، رہا کار زادوں، جھوٹے مدعیان مذہب کی دھجیاں اڑائیں، اس جذبہ کو خدا ماننے سے انکار کیا۔ جو انسانی تخلیق کا تراشا ہوا تھا۔ اس خیال میں جبر کی آمیزش بھی ہو گئی تو ایک رہستہ اور منکلا، اگر ایسا خدا ہے جیسا کہ ارباب مذہب پیش کرتے ہیں۔ ذاتی اور شخصی

خدا، جس میں "لوئے انسان" پائی جاتی ہے تو پھر وہ بڑا ظالم اور قہار ہے اس طرح وہ "باغیانہ میلان" جو باپ کی زندگی میں آبائی مذہب کی طرف سے پیدا ہوا تھا خود مذہب کی طرف بڑھنے لگا یہ تجسس پسند اور رومانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ناآسودہ رہتی ہے

نئی مقام پر حاصل نہیں تسرار ہمیں
مثال جوئے رواں بے قرار ہیں ہم لوگ

روزِ اک نئی زمیں سے گزرتے ہیں نفیس
ملنے ہوئے ہیں سوچے آب رواں سے ہم

اس باغیانہ میلان کا ایک سماجی اور سیاسی پس منظر بھی ہے۔ ہندوستانی سیاست اور سماج میں اصلاح پسندوں کے اٹھائے ہوئے خیر نے ایک طویل مدت میں نئی انقلابی قدریں پیدا کر دی تھیں جن کا ظہور پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ برطانوی استعمار نے ہندوستانی افلاس کو اس نقطہ پر پہنچایا تھا کہ جس کے آگے صبر و قناعت کی راہ سدود ہو گئی تھی بین الاقوامی حالات بھی آزادی کی راہ دکھا رہے تھے، اصلاحات کے ساتھ غیر مطمئن نظر نے کسی کو بھی آسودہ نہیں کیا تھا۔ متوسط طبقہ خصوصیت کے ساتھ غیر مطمئن نظر آتا تھا اس لیے بہت سے عناصر نے مل کر ہندوستان کو انقلاب کی راہ پر ڈال دیا۔ رومانی اور تصوراتی تفریر پرستی کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ شروع میں جوش اس سے بہت کم متاثر نظر آتے ہیں گو بعض

نظیں ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان میں ایسی بھی تھیں گئی ہیں جن سے ان کی ایسی سوچ بوجھ یا کم سے کم سیاسیات سے دھیس کا پتہ چلتا ہے "شکست زنداں کا جواب" (شعبہ و شبہ ۱) پر ۱۹۲۱ء اور "خدا سے ایک سوال" (نقش و نگار) پر ۱۹۲۲ء درج ہیں لیکن یہ تاریخی صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ اس زمانے تک ہندوستان کی تحریک آزادی اور انگریزی سرمایہ دارانہ نظام جوئی کے شعور کا جزو نہیں بنے تھے۔ لیکن اگر انگریزوں کی غلامی ایسی اہل حقیقت تھی جس سے کوئی ہندوستانی

لے جوش کی کتابوں کے جو ادیشن آتے کہیں (پیش) سے شائع ہوئے ہیں ان میں اکثر و بیشتر نظموں پر تاریخی دی ہوتی ہیں ان سے مدد لی گئی ہے لیکن یہ تاریخی بعض جگہ غلط ہیں۔ مندرجہ بالا دو نظموں کی تاریخیں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ان کے انداز بیان اور موضوع و دونوں میں ایسی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے جو ۱۹۲۵ء کے پہلے نظر نہیں آتی "شکست زنداں کا جواب" تو ۱۹۳۱ء کی معلوم ہوتی ہے شعبہ و شبہ میں جو حقتہ اصلاسیات کے عنوان سے ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ یہ تمام نظیں ۱۹۲۶ء کے پہلے لکھی گئیں (تاریخ کہیں پہلی تاریخ) لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس میں مولانا محمد علی جوہر پر بھی ایک نظم ہے اور مولانا محمد علی کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا اسی طرح مذکور صاحب سے خطاب ۱۹۳۱ء کے قریب لکھی گئی۔ پیرا سلام خیر آباد کے قیام کے بالکل آخری زمانے یعنی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی۔ باوجود شش کو سہو موبیا بھر کتاب کی غلطیاں ہیں۔ اس طرح کی غلطیاں بھی نئی ہیں جن سے کتابت کا شک برتا ہے۔ ایک ہی نظم شعبہ و شبہ اور حرف و حکایت دونوں میں ملتی ہے۔ پیدا کر کے عنوان سے شعبہ و شبہ میں ۱۱ء کے ساتھ درج ہے جو ان کے خطاب کے عنوان سے حرف و حکایت میں ۱۲ء کے ساتھ درج ہے۔

آنکھیں چرا نہیں سکتا تھا۔ ہر قدم پر اغلاس، جہالت، بیماری، غلامت
 گھٹی گھٹی سانسیں، رک رکی آپس، ہر موڑ پر ویرانی، بربادی اور تباہی
 ہر تقابل اسے اور نمایاں کرتا تھا، ان لوگوں کی خود غرضیاں اور بے لوث
 قربانیاں، وطن پرستی اور جماعت بندیاں، وفاداریاں اور بے
 وفائیاں، اتحاد اور افراق مرض کے احساس میں اضافہ کرتے
 تھے۔ انگریزی سامراج کے خلاف متحدہ قومیت کا ظہور ہو رہا تھا
 اس کے مستقبل کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور وہ تمام لوگ
 جو آزادی کے خواہاں تھے مذہبی تنگ نظری اور فرقہ دارانہ ذمہ داریت
 کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن سامراجی سازشوں، طبعاتی
 خود غرضیوں اور قدیم تہذیبوں کو رابغ کرنے کی تمناؤں نے متحدہ
 قومیت کے تصور کو کاری ضرب لگائی اور اتحاد پسندانہ ہوسکا جو
 غلامی کی ریش کو توڑ دیتا۔ جوش ان باتوں سے بالکل بیگانہ نہ تھے
 انھوں نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۱۸ء
 کی خشک سالی پر نظم لکھ کر دیا تھا، انھوں نے وطن سے وعدہ کیا
 تھا کہ تیری خدمت میں جان دے دوں گا۔ (وطن، اخلا و شبنم) اب
 ہم دنیا بدلی اور آزاد خیالی پیدا ہوئی تو ایک غلام ملک کی فریاد
 جس سنائی دی۔ اور شاعر کی حیثیت سے انھیں اپنے سرس
 کا احساس ہوا:

تراپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک ملت نے
 اب آج سے مجھے پروائے ننگ نام کہا۔
 ہوا ہے حکم کہ بے کام ہو جاؤ ہر سر سے
 اب اخلا و نسیم سبک خرام کہاں

ہوا ہے حکم کہ بن راز داوان آتش و برق
 اب آبِ چہرہ، خوابِ لالہ منام کہاں
 نظر ہے ادج پر جنبش میں پیر و آرز
 بساطِ خاک پر اب فرصتِ قیام کہاں
 تغیرات کی رو سے گزر رہی ہے نگاہ
 اب اہتمام تماشائے حسنِ بام کہاں
 اب حیات نے چھڑا ہے نقشہِ خویش
 مری زبان کہ اب رحمتِ پیام کہاں
 چلا ہوں سرِ کعبت اس سمت آج خودی جوئی
 اب آرزو کو سیرِ نامہ و سام کہاں
 (ترکِ جہود و شلہ و شبنم مگ)

یہ ایک رومانی خیال پرست کا عزمِ عمل ہے وہ چہرہِ خواباں
 اور تماشائے حسنِ بام کو ترک کر کے ملک و ملت کی آواز پر لبیک کہنے
 کا ارادہ کرتا ہے لیکن خیال میں تو وہ لبِ حیات کے نقشہِ خویش
 بنا رہا، عمل میں چہرہِ خواباں اور تماشائے حسنِ بام میں ابھار رہا انقلاب
 لانے کے لئے چہرہِ خواباں سے منہ موڑ لینا ضروری بھی نہیں ہے لیکن
 جوش کے یہاں ہر جذبہ کا ردِ عمل ... شدید ہوتا تھا، اُس لمحہ میں جب اُن
 پر ترکِ جہود کا جذبہ طاری ہوا محبوبہ کے چہرے کی رنگت پھسکی
 پڑ گئی۔ پھر حال ۱۹۲۵ء سے ان کے کلام میں ملکی اور قومی مسائل
 نے بھی جگہ پانا شروع کر دیا۔ تھوڑے دنوں میں وہ ایک انقلابی
 بھڑون اور انتہا پسند بت شکن کی طرح اپنی نظموں کے تیز اور زہریلے
 نثر لے ہوئے میدان میں اتر آئے۔ اس طرح پیچھے چلائے، تڑپتے

پھر رتے بگے بڑھنے لگے کہ انقلاب ایک خیالی ارادہ معلوم ہونے لگا۔ جوش اس پر غلوں سپاہی کی طرح گویاں چلاتے رہے جو جنگ فتح کرنے کی دھن میں اسناد دوانہ ہو چکا ہے کہ نہ اپنے ساتھیوں پر لگا رکھتا ہے، نہ میدان جنگ کی شاطرائہ چالوں سے کام لیتا ہے اور نہ جنگ کے دوسرے محاذوں کی حالت سے واقف ہے۔ سیلاب و مہرصر کی طرح ہر راہی دکھار پر بھجھاتے چلے گئے۔ بڑھوں کی اکھن میں یہ نعرہ لگایا ہے

کام ہے میرا تیرا نام ہے میرا شباب

میرا نعرہ انقلاب انقلاب انقلاب

غلاموں سے یہ کہا ہے

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیہ

اشاعر سے تو ملا دھڑا کے لیے نگاہ

شریکِ زندگی سے یوں مخاطب ہوئے ہے

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو

کیوں مرا زدن اب ہے اٹلی جامِ دُشو

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرم نواں

سجودِ زنار میں جگر اہوا ہندوستان

”نازک اندامانِ کالج“ کو اس طرح آواز دی ہے

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار

سینہ گینے ہیں بے جس کی ہر ملک سے خلفتار

شعلِ زینت سے مگر فرصتِ حقیں ملتی نہیں

کیا مہتار سے پاؤں کے نیچے زمیں ملتی نہیں

مسلمانوں سے کہا ہے

ہاں خود دوزخ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامہ احرام کہاں لکھا

ہندوؤں کو یوں ملکا رہا ہے

بازوئے در! ناخدا کی بے تیار ہو

ڈونے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو

اورد دونوں کو یوں مخاطب کیا ہے

توڑا اس جال کو جھکڑے ہے جو بازو پیرے

بستہ کشش سب سے دزخا نہ بن

پست سے پست ہو جو جزیرہ بن جائیگن

مر کے بھی جنس غلامی کا خریدار نہ بن

یوں جو کش کے سینے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کا طوفان

اُبل پڑا۔ غلامی سے نجات۔ ہندو مسلم اتحاد، عمل، انقلاب انھیں

کے گیت ان گنت راگوں میں گانے لگے اور جب ۱۹۴۷ء اور

۱۹۴۷ء میں کا پور میں زبردست فرقہ وارانہ ہنگامہ ہوا تو جوش

کے انقلابی غورے سرسای پھیچوں میں تبدیل ہو گئے

اے سب رو ابے حیا، حش، کینے بدگماں

اے جبین ارض کے داغ اے نئی ہندوستان

تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلام بے شعور

یہ فضاے صلح پرور، یہ قتلِ کان پور

تجھ کو عورت نے خا ہے جھوٹ ہے یہ اے نس

آرمی کی نسل سے اور تو! نہیں ہرگز نہیں

تیری جانب اٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ

سجدہ نما میں جگر طے ہوئے دیو سیاہ

تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیب

یوں ہسایا خون، امیدوں پہ پانی پھر گیا

رکھنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد

اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد

تاشیل کا پنور (شعلہ و شبنم ص ۵۰)

یہ عجیب غریب زمانہ ہے جو شمس کے نیچے زندگی اور سستی عروج پر ہے، وطن پرستی ترقی کر رہی ہے، مذہب کی حد بندیوں سے زندگی کھینچی مسکڑھوتی ہے، خدا کی حقیقت واضح نہیں، انسان مجبور نظر آ رہا ہے آزادی اور حب وطن کا جو جذبہ وہ پیدا کرانا چاہتا ہے لوگوں میں پیدا نہیں ہو رہا ہے، مجھیں اسی طرح دلاؤزیں، شامیں اسی طرح سلونی، برسات میں کوئل اور پیچھے کوکتے اور سور چنگھاڑتے ہیں، نشاط اور لذت پرستی کا ٹھکانہ نہیں ہے آبا، و اجداد کی عزت اور عظمت کا خیال بھی آتا ہے ملک کے افلاس پر دل بھی روتا ہے، بھرپور جوانی محبت کی تلاش میں ہے، مسائل حیات اور حیرے نگاہیں بھی بٹا دیتے ہیں ہندوستان ایک کہہ آتش فشاں کی طرح سگ رہا ہے، کبھی کوئی سیاسی تحریک اٹھ کر منزلی پر روشنی ڈال دیتی ہے، کبھی فرقہ وارانہ فساد آزادی کے جہاد کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ جو شمس ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو آنکھیں بند کر کے سوچیں، ان کی نگاہ ہر چیز پر جاتی ہے، وہ ہر معاملے میں رائے دینا چاہتے ہیں، ان کی شہرت بڑھ

رہی ہے۔ اقبال کے نام کے بعد ابھیں کا نام لیا جا رہا ہے، قوم پرست
 ابھیں اپنی آنکھوں کا تار بنانا چاہتے ہیں۔ رند ابھیں مذہداریت
 پیش کرتے ہیں۔۔۔ ان تمام باتوں کا احساس جو ش کو بھی ہے
 بعض مسئلوں پر وہ واضح خیالات رکھتے ہیں ابھیں سب حالت میں
ہیں۔ ہر خیال نیا خیال پسند کرتا ہے، ہر خیال کی مادی اور
 سماجی بنیادیں ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دور میں جو ش
 کی نگاہ ان مادی اور سماجی بنیادوں تک نہ جاتی تھی اور اگر جاتی
 بھی تھی تو انسان دوستی اور وجدان کی راہ سے۔

اس ماحول اور زندگی میں جو ش کی ذہنی کیفیات اور نفسیات
 کا مطالعہ کافی پیچیدہ نظر آتا ہے، غم میں خوشی اور خوشی میں غم
 کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، مستقبل کے متعلق سمجھی امید ہے کبھی
 نا اُمیدی۔ ایسی آویزشوں سے جو ش کی اس دور کی شاعری
 بھری بڑی ہے۔ بدبات اور احساسات کی تند و تیز دھڑکیاں
 حقائق کی راہ پر لانے کی کوشش نظر آتی ہے کیونکہ فلسفہ اور مشن
 کے مطالعے نے خیال اور احساس کی مادی اور سماجی بنیادوں کی
 جانب بھی کسی قدر ذہن کو منتقل کیا تھا۔ اب تک جوانی کا صرف
 صرف یہ نظر آتا تھا کہ اسے محنت کی فکر کر دیا جائے، اب میدان عمل
 میں سرکھٹ آنے کا دھیان بھی پیدا ہوتا ہے، اب تک زندگی صرف
 بزمِ ناز و نوش تک پروا نہ کرتی تھی اب ابھیں زندہ میرا شیوہ
 بننے کا خیال بھی آتا۔۔۔ ہے عورت اب تک صرف محبوبہ تھی
 اب اس کی ضعفی اور جفاکشی بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ
 مطالعہ: نشادہ، عتر اور نوا شش نے ان کی دنیا اتنی وسیع کر دی
 کہ ہر چیز ان کے لیے شاعری کا موضوع بن گئی، یہاں تک کہ گر رسمی

مذہب سے جوش دُور ہٹتے جا رہے تھے لیکن اسلام کی بعض مقتدر
ہستیوں کی زندگی کے وہ رخ جو ان کے نقطہ نظر کے واضح کرنے
میں آئین تھے وہ خاص طور سے پیش کر رہے تھے۔ آزادی سے
محبت، غلامی سے نفرت، رسمی ظاہر و رستوں سے اختلاف، محبت
عورت اور شرافت کی لطیف، مذہبی رہنماؤں کی زندگی میں
جہاں یہ پہلو دکھائی دیتے تھے۔ جوش انھیں پیش کر کے تمام لوگوں
اور خاص کر مسلمانوں کو جنگ آزادی کے قریب لانا چاہتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں ہندوستان کا جہاد آزادی ایک خاص منزل
پر پہنچ گیا تھا۔ قوم پرستوں نے "آزادی کامل" کا اعلان
کیا تھا۔ جوش نے بھی اسی سال اپنی نظم "حشر یدارتوبن" کا پہلا
شریوں سکھاے۔

اے دل آزادی کامل کا خریدار تو بن

پہلے اس کا کل بچیاں کا گرفتار تو بن

ساتھی کمپن اور گول مینز کاں فرس کے بہت سے کھیل کھیلے گئے

لیکن آزادی کے دیوانے ہر سارا جی چال اور ہر جاں سے بچتے رہے

جوش بھی ان چالوں سے واقف تھے۔ "ذوال جہانبان" (۱۹۳۸ء)

میں لکھا ہے کہ

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایاداری کی

جو غیرت ہو تو بنیادیں ہمارے شہریاری کی

نہ ہو مغرور اگر نائل برزی بھی ہو سلطان

کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے بزدل بنانے کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب سوہانا تھا

ضرورت ہے قص پر اب تجھے بجلی گرانے کی

{ تروپ: پیہم تروپ اتنا تروپ برق تپاں ہو جا
 خدا راے زمین بے حقیقت آسمان ہو جا }

ساتھ کمیشن کے آنے کے وقت لکھا۔

{ لگی ہے گھات میرا تھے تیری زنگی کی نگاہِ جادو دانا
 عدد تیری گزشتاری کی خاطر مہیا کر رہا ہے آب و دانا
 اگر جینا ہے آزادی سے بچنے کو سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ
 برداں دام بر سرِ بگڑ گڑھ
 کو عنقا را بلند است آستانہ
 (حافظ)

دامِ فریب (شعلہ و شبنم)

بہر حال ہندوستانی رہنما مراجی دام فریب میں نہ آئے اور پرنال فرانی
 اور قانون شکنی کی وہ تحریک شروع ہوئی جو تاریخ انقلاب میں یادگار رہے
 گی۔ قتل، خون اور ضبطِ املاک کا بازار گرم ہوا جیل خانے بھرے
 جانے لگے بڑے بڑے ہمت دالے خاموش ہو گئے، لیکن جو آتش نے
 ۱۹۳۱ء میں لکھا۔

نکلانضا پر صبح کا وہ نغمہ جلد سے
 گل بانگِ طائرانِ خوش اکیاں بے ہوش
 یہ رنگ کیا ہے کشورِ ہندوستان کا آج
 ہر ذرہ حقیقت ہے بناں بے ہوش
 ان جالیوں پہ مجس تار یک کی زجا
 یہ جالیاں ہیں جنبشِ مرغاں بے ہوش

ان کروٹوں کو اپنی منش کی سبک ز جان
 یہ کروٹیں ہیں موجب طوفاں بے ہونے
 ظاہر میں بزدلی ہے یہ دراگلی مسگر
 یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں بے ہونے
 آزاد لیں گے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
 زندا نیانِ عشق کو زنداں بے ہونے
 زنداں کا گیت (نخلہ شبنم ص ۴۰)

آزادی کا تصور واضح ہوتا تو طبقاتی تضاد بھی نمایاں ہو گیا۔ یوں تو کچھ
 دلوں سے ہندوستان میں علمی حیثیت سے اشتراکیت کا پرچہ اٹھا
 تھا، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان کا مقابلہ کیا جا رہا تھا لیکن
 عمل سیاسیات میں ان خیالات کا اظہار برائے نام ہوا تھا، اصلاحی
 سطح نظر انقلابی ہونا جا رہا تھا جو سن نے بھی اس زمانے میں جو نظائیں لکھیں ان میں
 اشتراک رجمان پایا جاتا ہے۔ جو سن کی ذہنی ساخت اور انسان دوستی کا
 پینٹنغی نتیجہ تھا کہ وہ غریب سے خوب تر کی طرف بڑھیں، جو چیز انسانی ترقی
 کی سست و رفتار کو بڑھانے اس کا ہاتھ دیں۔ جو ٹیک آزادی کی رفتار
 جن علی دینار یوں سے وہ چار ہو رہی تھیں جو سن کا ذہن ان سے آزاد تھا
 اسی لیے وہ ہر قدم پر قوم پرستوں کے ساتھ بجا نہیں چل رہے تھے
 بلکہ کبھی کبھی ان کے آگے بھی نکل جاتے تھے وہ شاعری کو بجز ہر
 رہے تھے اس لیے صرف عوام بجا نہیں سیاسی رہنماؤں کی رہبری
 بھی کرنا چاہتے تھے۔

ریاست حیدر آباد کی تنگ و تاریک فضا اس شکل کو بہت دلوں
 تک اپنے دامن میں جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ جو سن کی آمنش فی ایک

طرف شہریاری اور سرسرایہ داری، حکومت اور اقتدار پر آگ برس
 رہی تھی تو دوسری طرف ارباب مذہب بدظن ہو رہے تھے ریاستوں
 میں سازشوں کا جال بچھالنا، مطلق العنان امیر ریاست کو کسی ایک
 ذلیفہ خوار سے برگشتہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے، یہ کھیل وہاں
 ہر وقت کھیلے جاتے ہیں چنانچہ جوشن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حیدر آباد
 میں دس سال قیام کرنے کے بعد جوشن کو وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا یہی
 نظام، امرار، جاگیردار اور حکام جو جوشن کی شاعری کے دلدادہ اور
 ان کی صحبت کے خواہاں تھے، ان سے آنکھیں چرا کر الگ ہو گئے اور
 "عقاب شاہی" نے جوشن کو چند گھنٹوں کے اندر ریاست کے حدود
 سے باہر نکل جانے پر مجبور کیا۔ لانڈھیت، دہریت اور آزاد خیالی کے
 ساتھ ساتھ ان پر اپنے اشعار میں نظام حیدر آباد کی توہین کرنے کا الزام
 لگایا گیا اور جوشن سورہ عقاب ہو گئے۔ حیدر آباد چھوڑنے وقت
 جوشن کی سب سے بڑی آزمائش محبوبہ سے رخصت تھی۔ یہ غالباً جوشن
 کا اشعار داں اور آخری عشق تھا لیکن پہلے ہی عشق کی طمع شدید
 اور طوفانی، اسی طرح کامیاب مگر آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ
 حکم ہے کہ کوئی رخصت کرنے اسٹیشن پر نہ جائے مگر محبوبہ آتی ہے۔ اس
 کی یادگار جوشن کی خوبصورت نظم "شام رخصت" (آیات و نغمات)

ہے ہے

مجھ سے رخصت کی وہ شام اشکِ نشان پہاڑے
 وہ ادا کی وہ نغمائے گریہ سماں پہاڑے ہائے
 وہ مرے سینے میں سیلِ آبِ نائنسِ الاماں
 وہ ترے چہرے پر موجِ برقی دہاں پہاڑے
 وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے داسے غم

دھواں کا چہرہ رخ زیرِ داناں ہائے ہائے
 حسرت دیدہ اوریاں بہر آن بیتاب و شہید
 فرصتِ نظارہ دامنِ پیہم پرانٹاں ہائے ہائے
 یارِ رزتا سا غورِ عزم و محنت اکھنڈ
 دل جھبکتی سی نگاہِ فتنہ ساناں ہائے ہائے
 یارِ کھٹ پاچہ م لینے کی بھی سسکا آرزو
 دامنِ بھل گیسری کا خرم یا ساناں ہائے ہائے
 تنہا تے دلوں کی آچہ اور پیری جیس
 سناتی آہ اور میرا گلستاں ہائے ہائے
 میں سہرا پا سادِ عشرت اور ریشہ و غم
 تو مجسمِ ناز کی اور بارِ حرام ہائے ہائے
 وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت دے شوق
 وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا رماں ہائے ہائے
 اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
 جوش! میرا دل بوجاتا ہے دیراں ہائے ہائے
 اے نغاں بر لبِ ترنم اے خواں بر کھٹ بہار
 جوش تیرے دل کی دیرانی کے قرباں ہائے ہائے

حید آباد چھوڑتے وقت اپنے اور محبوبہ کے دل کی دیرانی کے سوا
 اور کوئی غم نہیں ہے

جس دن ہوا تھا کوہِ دیار حبیب سے
 میں کس قدر تھا بے سرو سامان و پوچھے
 ہنگامِ الوداع کسی دوشِ ناز پر

کیوں کھل پڑی تھی زلفِ پریشاں نہ پوچھے
 وقتِ فراق اکاکیں برہم کی چھاؤں میں
 افسردگی، جیسے، تاباں نہ پوچھے
 وقتِ سفر چھڑی تھی جواک لمحہ بیشنر
 وہ داستانِ دیدہ جاننا نہ پوچھے
 شرمندہ ہونے جائے کہیں، حسرتِ خدا
 اس بات کا انتفاتِ فراواں نہ پوچھے
 جس اب بھی جوش کو جو سہارا دیے ہوئے
 اس شوخ کے وہ عہد، وہ بہاں نہ پوچھے
 نوجوانِ فراق، (حرفِ وحکایت ص ۱۰۰)

مرت کے آغوش میں چھینے کا ساں کیا کروں
 کیا کروں اے بیچِ کتابِ شام بھراں کیا کروں
 اب نہ نقدِ عافیت باقی، نہ تو تیرِ حیات
 اب خیالِ دزد، خوب دشمن جاں کیا کروں
 بھاگتی ہیں راحتیں مجھ سے جدھر جاتا ہوں میں
 اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں
 دل سے تا ذراتِ دائم کوئی نئے ساکن نہیں
 کیا کروں اے گوسشِ گردِ دینِ گرداں کیا کروں
 سر میں اک سودا سا ہے اور وہ بھی سودا شوق کا
 دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی غریباں کیا کروں
 ہو چکا ہے فکرِ ننگِ دمام سے فارغِ دماغ
 اب یہ دامن کیا کروں اب یہ گریباں کیا کروں

امروڑ بے غور و حریف و حکایت میں ۸۶

ملیج آباد چھوڑ کر حمید آباد میں وطن کی طرح مستقل رہے تھے۔ اب حیدر آباد چھوڑنا تو نئے سرے سے گھر بنانا پڑا۔ جو باتیں ملیج آباد سے وابستہ تھیں ان سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ "تھر سحر" کا نہ اتر چکا تھا، خود اپنی زندگی نئے محور کے گرد چکر کھار ہی تھی، بچوں کو دیہات کی زندگی پسند نہ تھی، زمین داری کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس سے پیٹ بھر سکے، اس لیے دھلی میں قیام کر کے جنوری ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "کلیئم" جاری کیا اور وہ مجسوعہ "نقشہ نگار" اور "شعلہ و شبنم" شائع کئے۔ پہلے نظروں کو سونو سار کے اعتبار سے ترتیب دیا اور مختلف جلدوں میں شائع کرانے کا خیال تھا، چنانچہ اشتہار ای طرح دیے گئے تھے لیکن بعد میں وہ ترتیب قائم نہ رہی، کلیئم نے ٹھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی، اس میں جو شش نے نشر کے مضامین بھی لکھے، یہ نشر "روحِ ادب" کے دور میں بھی لکھی تھی لیکن اس دور کی نشر میں صرف شاعری تھی، "ادب لطیف" لکھنے کی کوششیں تھیں اب ملکی اور ادبی مسائل، فلسفہ، مباحث اور سماجی حقائق پر بھی نگاہ پڑ رہی تھی، فطری جو شش اور شدت احساس ان مضامین میں بھی نمایاں ہے، رنگین ضرورت سے زیادہ ہے، استدلال پر جذباتی انداز، نظرِ حادی ہے لیکن اس میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور بہتری کی جانب اشارہ کرنے کی کوشش کا فرما ہے۔

دھلی کے قیام میں جوش کو ہندوستان کے متعذر سیاسی رہنما،

یہ ان مضامین میں اکثر کو لکھا کہ "نظامِ ستارہ" ایجنسی دہلی نے اشادات کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

ملنے کے مواقع ملے۔ بھرت شاہی نظام کو قریب سے دیکھنے اور آزمانے کا موقع نصیب ہوا۔ آزادی کی جدوجہد شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ نیا دستور ہندوستان پر عائد کیا جا رہا تھا، انتہا پسند جماعتیں ابھر رہی تھیں، "عین ترقی پسند صنفیں وجود میں آچکی تھیں اور ادبی فن پر نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے، جوش بکچہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی شاعری کو ملک کی دوسری ترقی پذیر قوتوں سے ہم آہنگ کر دینا چاہتے تھے، "فرمن اور محبت کی جگہ میں بھی نرمن کی جیت ہوتی تھی، کبھی محبت کی اور یوں جوش کی شاعری کا کارواں طوفانوں سے کھیلتا، لگتا انوں میں گلگشت کرتا، آندھیوں سے لڑتا، نسیم سحر کے جھونکوں میں ٹھہرتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نیا پود کے اکثر شعراء ان سے متاثر تھے۔ انھیں "شاعر انقلاب" اور "شاعر اعظم" کہہ کر خطاب کیا جا رہا تھا، "ہر بھی تختہ کاری کی منزل میں تھی اس لیے خیالات میں زیادہ گہرائی نظر آتی ہے۔ عقل اور جنون کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے، حقیقت انسان سے دست درگیاں ہے۔ محبوب چونکہ عقل میں نہیں اس لیے | ترانہ بہار چھڑتے ہیں تو یہ گیت گاتے ہیں۔

پھر دامن صبا میں ہے مینا آجکل
پھر ہر نفس ہے گردشِ بہانہ آجکل
پھر عقل میں ہے غمِ دشت کی خواہش
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آجکل
پھر جوش پر ہے موسمِ برنائی جمال
پھر بارش پر ہے عتوہ زکات آجکل
پھر فرش پر ہے جلوۂ انلاکِ ان دنوں
پھر عرش پر ہے غرۂ مستانہ آجکل

پھر ہر غلام دہرے آقا کے عہد پر
پھر ہر کینز شہر ہے سلطانہ آجکل
جس پر شمار کون دسکاں کی حقیقتیں
بھر کہہ رہا ہے جو شش دہ افادہ آجکل

لیکن جب انہیں دلوں الے تیمور کو گداگری کرتے دیکھتے تو۔
”بھکار بن سنہزادی“ کی سی منظم سمجھتے تھے، لوگوں کو سرگرم عمل
دیکھ کر اپنے فرض کا خیال بھی آتا تھا۔
جب ملاتے ہیں فراغِ دُعا دناک آواز سے
سورما منہ پھیر لیتے ہیں حرمِ ناز سے
زندگی سنہ دیکھنے لگتی ہے جب تلوار میں
روشنی رہتی نہیں محبوب کے رخسار میں

لیکن جب عیش کی ترنگ بڑھتی تھی تو کہتے تھے۔
میں نے اک دنیا نئی معلوم کی ہے روح میں
دل فریب و دل نواز و دل فروز و دل نشیں
اس تڑپتے تھلاتے خاکدانِ غم سے دور
اک دیکھتے جھلکاتے، بزمِ بہناں سے قریب

لے یہ دوست کی مجھے میں نہیں ہے۔ میں نے انہیں دلوں دینے ۱۹۳۷ء
یا ۱۹۳۷ء میں) تاج دہلی میں تین شہر ”فرمان اور محبت“ کے عنوان
سے پڑھے تھے وہ یاد رہ گئے!

علت ایجاد مرگ و زلیست جبر و اختیار
 عقل کی اس بیوگی سے جس کو کچھ نسبت نہیں
 خون کی گردش میں مضمر ہے جہاں ذکر صیب
 نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں حلِ لبث
 کون یہ درکشکھاتا ہے مرا؟ پوچھو کوئی؟
 خیر ہو کیا اس طرف بھی آگئے اہلِ زمیں؟
 • آئے ہیں دنیا کے کچھ اوتار بھرے کو حضور •
 ”کہہ دو واپس جائیں ملنے کی مجھے فرصت نہیں“
 دل کی دنیا۔ (حرف و حکایت ص ۱۴۴)

ہوش کی ذہنی کیفیات کی تصور کش ایک نظم سے ہمیں ہمیش کی جاسکتی
 ان پر ایک وقت میں ایک جذبہ آفا شدت سے طاری ہوتا ہے کہ
 جب تک وہ شعوری طور پر کوشش نہ کریں اس جذبہ کی بحیدگی یا
 زندگی کی مجموعی کیفیت کو اس لمحہ میں نہیں دیکھتے۔ اس زمانہ میں
 وہ دل کے پاس با سببان عقل کو نہیں آنے دینا چاہتے۔ شاعر
 کی ہمہ گیر شغفیت ہر چیز کا جائزہ لیتا ہے لیکن ہر واقعہ اور ہر خیال
 کو اس کے تمام روابط اور تعلقات کی روشنی میں دیکھنے بغیر
 صحیح فلسفیانہ نقطہ نظر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ بھی حقیقت کا ایک
 تصور ہے کہ جو چیز جس وقت جیسی معلوم ہوتی ہے اُسی طرح ہمیش
 کردی جائے لیکن حقیقت کا حکیمانہ تصور یہ ہے کہ اس کی مجموعی اہمیت
 کو سامنے رکھ کر خیرہ نکالا جائے۔ اس زمانے میں ہوش اپنے شاہد
 اور مطالعہ کے بھرد سے پر بار ایک سے بار ایک نفوش بنا سکتے
 تھے اور اس کو غر کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔

کبھی دلِ فخر سے دیتا ہے آواز
 کہ ایک تنہا کے ہلکا آسمان ہے
 کبھی منبر یاد کرتا ہے کہ مجھ پر
نفس کا قتل بھی لگاؤ گراں ہے
 کبھی ہر ذرہ خاک کا عکس
 کبھی شمس و قمر پر حکمراں ہے
 کبھی ہے کامراں ہو کر بھی ناکام
 کبھی ناکام ہو کر کامراں ہے
 کبھی لطیف خداوندی سے منسوب
 کبھی جو بیتاں سے کامراں ہے
 کبھی مریخاں کی جھنڈ سے کہن سال
 کبھی صدیوں کی کاوشوں سے جواں ہے
 سس اے غافل! کہ جس دل کے ہیں طور
 وہ دل ہم شاعروں کا آسناں ہے
 دماغوں پر کھلیں ہسم کیا کہ ہم کو
 وہ سمجھے گا جو دل کا رازواں ہے
 خامو کا دل (مکروہ فاشا طعن و تمہید)

لیکن ضرورت اور وقت کا احساس کچھ اور مطالبہ کرتے ہیں۔ ہر
 صاحبِ شعور کو اپنے تعصبات میں یک رنگی، ہم آہنگی اور منطقی تسلسل
 پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات سے دوسروں
 کو متاثر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش اپنی مزاحیہ انفرادیت کے باوجود
 کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین کے

ہندوستانی تہذیب کی ایک کان فرس آباد میں منقذ ہوئی مجلس
صلحت میں جو شش بھی تھے خطہ صدارت میں انھوں نے گفتگو اور
تدبر کی اہمیت پر زور دیا اگرچہ اس خطبہ میں ان کے عقیدہ جبر نے
انھیں بہت سی ایسی باتیں کہنے پر "بجور" کیا جو یکسر متضاد اور رکنا ہیں
اس کا غصہ نہ کہیں اور ہوگا یہاں صرف اتنا ہی تذکرہ مقصود ہے
جس سے ملک کے ذہنی اور تقار کا کوئی پیر کا کھلے اس خطبے میں وہ مکمل انقلاب
کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر طرف انقلاب کے آثار ہیں
مگر ہندوستانی انھیں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے،

— خدا را بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟
کر سینہ ہندوستان میں انقلاب کا جو سرخ
شعلہ آہستہ آہستہ پھر تھرا رہا ہے اُسے
ہر ادینا شروع کر دیا جائے ؟ انقلاب ! انقلاب
ہر شے میں انقلاب ؟ زندگی کے ہر شعبے میں
انقلاب آداب و رسوم میں انقلاب نظریات
و معتقدات میں انقلاب سلمات و کلیات
میں انقلاب سیاسیات و مذہبیات میں
انقلاب یکسر انقلاب تمام تر انقلاب اور مکمل
انقلاب !

اشارات (جوش) ص ۲۲

انھیں احساس ہو رہا تھا کہ

— اس وقت ہندوستان زندگی کی ضرورت میں
جان و دل ہی کی قربانی کے لیے بجلی ہوئی ہیں ؟

وہ کہہ رہے تھے :

میں سیرِ دست اپنی قوم میں یہ دیکھتا
نہیں چاہتا کہ دل داغ پر غلبہ حاصل
کیے رہے ۔

کیوں کہ بھوک نے ڈری ہے روزِ گاری، بیماری اور جہالت ایسی
حقیقتیں ہیں جن سے ہم کھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ اسی خطبہ صدر
میں لکھتے ہیں :

میں ایک مدت سے سنتا چلا آ رہا ہوں
کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے
حساس، خود را، اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر
میرے ہندوستان میں بھی ایسی قومیں
اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو
ہو کر گڑا گڑوس لگا کر خدا را اپنے ادب میں عظیم
انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی
کو خونی گرداب کے خون آشام دانتوں سے
چھڑا لیجئے اور نہ کشتی ڈوب جائے گی اور
شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات
میں حیاتِ بیداری کا خون دوڑائیے اور
وطنِ عزیز کے لیے دلوں کی طرح دھڑکتے
ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند
تیار کیجئے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے
سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نفری
جلوس فوجِ مد فوج اور قطارِ اندر قطار

ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے ایک صحیح جنبش قلم شتر ہندو
برہمنہ تلواروں کے مفت بلہ میں زیادہ کارآمد
آزاد جنگ ہے۔

اشارات (جوش) ص ۲۸

یوں انفرادی خواہشوں اور حقیقتوں میں جنگ جاری رہی ایسا
لگتا ہے کہ جوش اسے ٹھیک سے حل کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، اس
کشاکش میں لذت لیتے ہوئے، کبھی احساس کی شدت اور کبھی بے بسی
کی دعا کرتے، کبھی علم کی پیاس اور کبھی معدوم جہالتوں کی تمنا کرتے
آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس دور میں جوش نے رہائیاں بھی بڑی
تعداد میں کھلی ہیں بڑی نادر اور خوبصورت بڑی رنگین اور بصیرت
افروز، ان میں شاعر کی روح کی کشاکش نمایاں ہے۔ حقائق
کی جستجو کا سلسلہ جاری ہے، بھر کی حکومت ہے اور آزادی
اور عمل کی خواہش، شراب تابیہ تربیت روح رواں، بن چکی
ہے اس زمانے میں جوش کے دو اور مجموعے سکروناٹا اور خون
وحکمت شائع ہوئے۔ آخر الذکر میں صرف رہائیاں ہیں۔

جوش، دہلی، بمبئی، دھولپور، لکھنؤ اور ملیح آباد میں رہتے تھے
دہلی میں مرکز اور مستقر تھا، کلیم کا خیر مقدم ملک میں بہت شاندار ہوا
تھا لیکن جوش اسے تاجرانہ حیثیت سے جملانے میں ناکام رہے
خیر آمدنی سے زیادہ تھا اور دہلی میں قیام ناکھن تھا اس لیے
پھر ملیح آباد کا رخ کیا۔ چنانچہ کلیم کو لیے ہوئے ۱۹۲۹ء میں ملیح آباد
چلے آئے۔

جون ۱۹۳۸ء میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ جس کا تذکرہ کئی خبیثتوں سے ضروری ہے۔ جوشتی بمبئی میں ہیں کئی عزیز اور دوست ساتھ ہیں، محبوبہ بھی ہمراہ ہے، اندھیرا ہو چکا ہے۔ آپاؤ کی سیر ہو رہی ہے تند دتیز ہوا میں چل رہی ہیں، سمندر کی لہریں ساحل پر جڑھتی ہوئی چلی آرہی ہیں اور تماشا یوں کا ہجوم اردو باد کی وجہ سے بھٹ رہا ہے جوشتی ادران کے ساتھ بھی واپس آنے کے لیے مڑتے ہیں۔ محبوبہ کی زندگی شدید کشمکش کی زندگی ہے وہ سب سے پیچھے رہ جاتی ہے اور جیسے لوگوں کی بیٹھ ادھر سے پھرتی ہے وہ خود کشی کی نیت سے اپنے کو سمندر میں گرا دیتی ہے۔ جوشتی نے رونا کر دیکھا تو وہ موجوں کی بیچ و تاب میں آخر کار نہ ہاتھ پیرا رہی تھی وہ خود بھی پیرنا نہیں جانتے لیکن ایک لمحہ کے اندر وہ بھی سمندر میں کود پڑے اور انھیں خود جنر نہیں کہ کس طرح انھوں نے محبوبہ کو بچا لیا۔ اس حادثے کو یاد رکھنے کے لیے جوشتی نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے

..... تین نظمیں "تو اگر داپس ذاتی" "نیامرت"

، "نایع بحر کی خدمت میں" ان کے مجموعے آیات و نغاث میں شامل ہیں تینوں نظمیں غیر معمولی شدت احساس اور رنگینی کی حامل ہیں ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جوشتی سمندر میں اس لیے کود پڑے تھے کہ یا تو محبوبہ کو بچائیں گے یا پھر خود بھی دامن آب میں سر پڑیں گے

۵

تو اگر داپس ذاتی بحر سبت نامک سے

حشر کے دن تک دھواں اٹھا بلبل خاک سے

ہاتھ آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں

دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

ان وہ طوفانِ وہ بھیانک تیرگی، وہ ابرِ دہاد
 وہ ہوائے تندِ بارانِ وہ خودِ ششِ برفِ درِ عمد
 دھنستہ وہ روشنی کے سلسلے کا رطبت
 وہ گھٹاؤں کی گرج سے بھری رمل جھوٹا
 وہ پاتو کے پلجے کی بھلجی "مان سون"
 وہ سمندر کے تھپڑے، وہ ہواؤں کا جنون
 اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
 کو دھڑنا وہ سمندر میں تراکبِ بارگی

تو اگر داپس نہ آتی جس ہر ہیتِ ناک سے
 حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
 اس دلِ سوزاں میں آتے اس ہلا کے زلزلے
 آسمان روتا، زمیں ہلتی، سارے کانپتے
 موت اور پھر موت تیری، اٹھنا والا ماں
 بڈیوں سے آپکے اٹھتی اور بالوں سے دھواں
 لیکن اک لمحے کے بعد اے مگر حسنِ دیوات
 جوش کو بھی کا دِ شترِ مہما سے مل جاتی نجات
 پہلے ہرنا اک طلاطم ایک طوفانِ ایک جوش
 بعد ازاں تو اور میں اور بحرِ دباراں کا خود
مقامِ ریح ہوتا موت کے گرداب میں
 آتشِ غم سرورِ ہوجان کنارِ آب میں

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا

بے بے آتی ہمارے گلگننے کی صدا
 جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پیچھے کوکتے
 نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
 رات جب کچھ بیگ جاتی اور جھک جاتا تر
 سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
 بھیڑنا جب کوئی ساحل پر ہماری داستان
 پڑنے لگتیں کبھر پر دھندلی کی تو پر چھایا
 زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
 سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تارِ خمیہ ہم
 وقف ہو جاتے محبت کے فانی کے لیے
 سر دھو کر آگ میں جاتے زمانے کے لیے
 تو اگر اپنی ذاتی آیات و خات میں ۱۰۰

کامیاب محبت کے انسانی نقطہٴ موعود پر پہنچ کر موت کی خواہش ادا
 محبت کا اگر انقدر عطیہ ہے نہ محض بخشش پرستی یا دوا نیست نہیں ہے بلکہ
 عالم وصال میں ابدی زندگی پالنے والے زندہ جاوید بن جانے کی ترقی کی
 مظہر ہے۔ جو نظم جو شش کے کردار کے جذباتی پہلو براتی نیز روشنی و آبی
 ہے جس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔

جو شش پنج آباد میں رہنے لگے، قدیم صحبتیں بزم ہو چکی تھیں، بُرائی زندگی
 اور اداس کہہ چکی تھی، شعروشاعری اور مطالعہ میں شغف صرف ہوتا تھا، چند قدموں
 کے فاصلہ پر نکھٹو تھا جس کی گلیاں دل میں بسی ہوئی تھیں۔ کلام بلند کر چکے
 تھے، نقطوں کا ایک اور مجموعہ صرف و حکایت شائع کیا تھا، حیدر آباد
 کی پیشانی بنیاد سے ایک وظیفہ، کتابوں کی آمدنی اور صورتی بہت زمیڈی

جس کی حالت ابتر تھی، یہ آمدنی کے ذریعے تھے، زندگی کچھ خاموشی سی تھی، کوہِ سری {
 جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ خوشی کی سیاحی شاعری سامراج دشمنی اور انگریز دشمنی
 کے جذبات سے ملنے لگی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ ایک طنزیہ نظم "فادارانِ اڑلی
 کا پیغام" شہنشاہِ ہند کے نام "لکھ چکے تھے اس درمیان میں انگریزوں
 نے ہندوستانیوں کے آزادی کے مطالبات کو بار بار ٹھکرایا تھا
 ایک ایسا دستور اساسی ان پر مسلط کیا تھا جسے ملک کی ہر سیاسی جماعت نے
 ناپسند کیا تھا۔ اب جو جنگ شروع ہوئی تو جذباتی ہندوستانیوں
 کو فطری طور پر خوشی ہوئی کہ انگریز محبت میں مبتلا ہو گئے۔ شہنشاہینس
 خوفناک اذیتوں کی گتہ گیس۔ انگریز نے اپنے غلام ہندوستان سے
 بھی میدان میں اترنے کو کہا۔ جوش نے یوپی کے گورنر سر ہارس پڈ
 کی وہ اپیل پڑھی جس میں یوپی کے باشندوں سے جنگ میں جان
 و مال سے مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ ہندو
 نے اپنے ہندوؤں کو اٹھار دیا ہے کہ وہ دنیا سے تہذیب اور نظامِ عدل
 کا خاتمہ کر دیں، ان خوشنوا درندوں کو رد کرنے کی کوششیں سرکشی
 کا انسانی فریضہ ہے۔ جوش کے سامراج دشمن اور قومی جذبات کو اس
 چوٹ لگی کہ انھوں نے چند لمحوں کے اندر اپنی مشہور نظم "ایٹ انڈیا
 کمپنی کے فرزندوں سے" لکھ ڈالی جو شائع ہو کر ضبط ہو گئی۔

جوش نے یہ نظم لیٹ آباد میں لکھی اور دوسرے روز لکھنؤ آئے۔ سب سے پہلے راقم الحروف
 کے عزیز خانہ پر تشریف لائے اور کہا "دس سٹ میں ایک نظم لکھی ہے سنو" میں
 بہت تنگوش ہو گیا۔ پوری نظم سنائی کچھ جنگ کے متعلق نام کی جانے لگے
 تو میں نے کہا "بھلا شائع کہاں ہو سکے گا، ایک نقل میرے کھ لوں" وہ کاغذ
 مجھے دیدیا۔ اس طرح لکھی ہوئی تھی کہ میں نے جوش کی مدد سے اسے نقل کیا۔ میرے
 یہاں سے "نیا ادب" کے دفتر میں پہنچے۔ سردار جعفری نے وہ نظم لے کر (اپنی کاپی)

کچھ دنوں کے بعد جوش نے سمجھو ہی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اپنی
 طویل نظم ”جوت آخر“ کا خاکہ لیا۔ آباد ہی میں بنا چکے تھے۔ کچھ
 اشعار لکھ بھی گئے تھے اور اس کے مکمل کرنے میں ایسا ہنسا کہ تھا گویا پانچ
 چھ ہزار اشعار کی نظم بند ہے ہی۔ ان میں ختم کر لیں گے کبھی کبھی دو ماں
 نظیں اور راجاں میں لکھتے تھے۔ اپنے پروگرام اور پروگرام۔ نفس و نگار
 کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ ادبی جلسوں اور محفلوں میں بھی شریک
 ہوتے۔۔۔ زمانہ محفلوں میں بھی عزیزوں اور دوستوں کے یہاں
 بھی جاتے اور ٹھہرے باہر بھی۔ تمام ہوتے ہی ”بیان کیفیت طلوع“ ہو جاتے
 مختلف مقامات پر نشستیں ہوتیں۔ وہاں مخصوص اجاب ہوتے اور کبھی
 شعرو شاعری میں، کبھی باتوں میں وقت گزرتا۔ ان محفلوں میں زیادہ
 تر جوش کے پرستار ہوتے تھے جو کبھی کبھی امرار کے دربار کی کیفیت
 پیدا کر دیتے تھے۔ محفل گو انداز گفتگو، لطافت و طرائف نشست
 و خواست کی یکسانیت کبھی کبھی ان لوگوں کو اکتا بھی دیتی تھی جو محفل
 میں شریک ہو کر باہریشن تماشا شانی بھی بن سکتے تھے۔

جوت آخر کے لیے جوش نے مطالعہ کی رفتار اور نوعیت تبدیل
 کر دی تھی۔ نہ سب فلسفہ اور سامنی کی کتابیں خاص طور سے پڑھ
 رہے تھے۔ عقدہ جبر کی روشنی میں نظیں ہی نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱ مشتمل: ”بیاد“ یہاں چھاپ دی۔ جوش نے ہر ضبط ہو گیا۔ پھر
 سے آزادی نظیں“ نامی مجموعہ میں نقل کیا گیا۔ وہ کتاب بھی ضبط ہو گئی۔ یہ نظم
 جوش کے کبھی مجموعہ میں نہیں ہے۔ محض ٹرے دنوں کے بعد جوش کے یہاں تلاش
 ہوئی، تلاش پر ایک نظم لکھی، وہ بھی کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ بعض دنوں کہنے نے ”شکوہ عظم
 سے خطاب کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو جوش سے سب کی گئی۔ وہ نظم جوش کی نہیں ہے۔

کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ جنگ نے ایک نئی کرکٹ لی تھی۔ جرمنی نے روس پر حملہ کر کے لڑائی کی شکل بدل دی تھی۔ دنیا کے ترقی پسندوں بھڑک اُٹے۔ روسیوں اور آزادی کے خواہوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جس کے خیال میں اب جنگ سامراجی طاقتوں کے درمیان نہ تھی بلکہ ترقی اور رجعت کی قدیم ایک دوسرے برسرِ بیکار تھیں۔ ایک طرف سوویت روس، انگلستان، چین، امریکہ اور ان کے نام مغتربہ قوتوں کی رُو میں یقین جھنپیں پھلنے لگے۔ انہوں نے کچھ دباؤ ہوئے آگے بڑھ رہا تھا دوسروں طرف جرمنی، اٹلی، جاپان اور مغتربہ ممالک کے زور سنبھلا غلام تھے۔ ایسی شدید کشمکش تھی جس میں ٹیکل پرست اور جذباتی انسان کے لیے کوئی فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ جوش کی انگریز دشمنی آہی شدہ تھی کہ وہ کسی خیمہ پر نہیں چڑھ پائے۔ جاپان نے بھی اپنا فوجیں کھیل شروع کر دیا تھا، لایا، برآ، اندو پائنا، اندو تھیا سب نسخے ہو چکے تھے۔ اب جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہونا چاہتی تھیں، جوش جاپان کی اس فوجی فاشزم سے متفرق تھے لیکن چونکہ جاپان انگریزوں کا دشمن تھا اس لیے جوش پھر خاموش رہے یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۲ء میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر بھرپور وار کر دیا۔ جب ہندوستان کے سیاسی رہنما اختلافات کے باوجود حالات کی رفتار اور واقعات کے دباؤ کو پیش نظر رکھ کر انگریزوں سے قوی حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور آزادی کا اعلان چاہتے تھے تاکہ وہ منہ دشاہوں کو کوئی جھٹ انقوم جنگ میں شریک کر کے جاپان کا ساتھ دے سکیں انگریزی حکومت نے انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے جیلوں میں بند کر دیا۔ عوام نے اُن سے اُن سے ہو گئے ان میں فاشزم سے نفرت کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا وہ پھر پیچھے ہٹ گیا اور انھوں نے اپنے خالی ہاتھوں سے انگریزی

برہان کے جو آج ہے دن بھی سیاہ رات کیا غم اگر زمین پہ وہ آگدیر محاسن
 یعنی جرم دہر و بدسرمان کائنات انسان کو آج روند رہے ہیں جو خدا و بنا
 کل ان کو جو خوش روندنے والا ہے آدمی
 آدمی نامہ (عرش و عرش ص ۵)

کھیل ہاں اے نوب انسان ان میرے اتوں سے کھیل
 آج اگر تو غفلتوں میں پاپہ جو لاں ہے تو کیا
 سکرانے کے لیے بے جیس ہے مسیح وطن
 ابد چند نے طلبت شام غم جاں ہے تو کیا
 شصیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
 ابر غم زلف جہاں برباں جنباں ہے تو کیا
 نظام نو (عرش و عرش ص ۵)

انھیں دنوں جو شش شمالی مار کچر بس ہونا میں شامل ہو گئے، پونا اور
 بمبئی کے قیام میں جو شش کو ہندوستان کی سیاست پر نئے سرے سے غور کرنے
 کا موقع ملا۔ ہندوستان کے زیادہ تر رہنما جیلوں میں بند تھے جو باہر
 تھے وہ بے دلی سے فاشیزم کو رجعت پسند تحریک بتا رہے تھے، صرف
 کچھ ترقی پسند فاشیزم اور سامراج دونوں کے گٹھے گھونٹ دینے کی تدبیر
 بتا رہے تھے اور ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو بین الاقوامی
 حالات کے پس منظر میں حل کرنے میں کوتاہاں تھے، جو شش نے بھی اس نقطہ نظر
 کو تسلیم کیا اور جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں بمبئی کی تقسیم ہند متفقہ بنی تو
 میں شریک ہوئے تو تذبذب قریب قریب رہ رہ کر ہو چکا تھا۔ انھوں نے سامراج
 نظام کے ساتھ جو بیان دیا وہ ان کے خیالات کی واضح تصویر ہے۔ اس

بیان میں جوش آنے کا واضح طور پر ہندوستان کے لیے ایک اشتراکی نظام کا خیال ظاہر کیا ہے ہندو مسلم اتحاد، قومی حکومت، آزادی، ناشرزم، کاشتیاں اور نئے ہندوستان کی بیان اس بیان کے مرکزی خیالات یہ ہیں:

— ہمارے نزدیک ان حالات میں ملک کے تمام اور جموں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام ہندوستانی قوم کو موجودہ خطرات سے آگاہ کریں، انھیں اتحاد کے لیے اٹھائیں۔ اگر ہم متحد ہوتے ہیں تو کامیابی کا سہرا ہمارے سر پہ گرا اور وہ عوامی آزادی جس کا ہم صدیوں سے خواب دیکھ رہے ہیں حاصل ہو جائے گی اور ہم دنیا کی متحدہ اقوام کے ساتھ ایک آزاد حیثیت سے اس نئی دنیا کی تعمیر میں حصہ لے سکیں گے جو فطرتی بربریت کی شکست اور سامراج کی نیند کشی کے بعد سرحدیں وجود میں آئے گی۔

ایشیا (پونا) مئی جون ۱۹۴۳ء

اشتراکی فلسفہ ہندوستان کی سرزمین میں جو پکڑا جاتا تھا اس لیے سارے رجعت پسند شعوری یا غیر شعوری طور پر اس طوفان کو روکنے کی تدبیروں میں لگ گئے، یہ دشمنی بسنی سے پھوٹ رہی تھی اس لیے وہیں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ لوگوں نے انہیں اصلاح ادب قائم کر کے ترقی پسندی کی مخالفت میں، راکست ۱۹۴۴ء کو ایک جلسہ کیا جس میں بڑے بڑے خود ترقی پسندوں کے گمراہ کن ادبی رجحانات سے ہزاری کا اعلان کیا گیا۔ جوش ادبی تحریکات

کی بنیادوں سے اس قدر واقف ہو چکے تھے کہ انھوں نے فوراً اس
 کانفرنس کی تجاویز کا تجزیہ کیا اور ایک دلچسپ طویل مضمون "ادب
 اور احتساب" کے عنوان سے لکھا جو مختلف رسائل میں شائع ہوا۔ مضمون
 جوش کے ذہنی ارتقار کی ایک خاص منزل کا نشان بردار ہے۔ اس
 مضمون میں انھوں نے ایک وکیل کی طرح ترقی پسند ادب کی حمایت
 کی۔ رحمت پندی کہی بھیس میں ہوا جوش اس زمانے میں اس کی مخالفت
 ضرور کرتے تھے، ہاں جہاں ان کا شعوران کی خیال پرستی کا پورا ساتھ
 نہیں دیتا تھا وہاں وہ عقیدے کی گود میں گر جاتے تھے۔

اس زمانے میں جوش اچھے برے فلمی گیت نگار رہے تھے، نظریں کم
 رباعیاں زیادہ لکھتے تھے۔ ایک نئی اکھن یہ پیدا ہو گئی تھی کہ جوش کی
 ناہنالی جاگیر ان کے ماموں کے لاؤڈ اشتغال کر جانے کی وجہ سے لاؤڈ
 پڑی تھی۔ جوش کے نشروں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہی ان کے وارث ہو سکتے
 ہیں چنانچہ جوش کچھ دنوں تک ہولیوڈ بھی آتے جاتے رہے لیکن اس مہم
 میں انھیں کامیابی نہ ہوئی، اس کے اثرات ان کی بعض رباعیوں و سنبھل
 و سلاسل میں (۱۹۵۱ء) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اشتراکی اثرات دلچسپ جوش
 کی نہ جانے کتنی نظموں میں نمایاں ہیں لیکن اسی سال یعنی ۱۹۵۲ء میں
 جوش نے کارل مارکس کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

اسلام اے مارکس اے دانائے راز

اے ربیع انسانیت کے چارہ ساز

نخل خوشحالی کی بیج دیجئے تو

عقدہ ہائے زلیست کا حاصل ہے تو

انہیں تو میں اگر تیرا نظام

آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام

دشمن پیکار پست و بلند
 حامی بیچارگان درد مند
 منکر دارائی عرش بریں
 ادلیں پھینبہ فرشتے بریں
 ہند را آتش بہ چاکدار
 پائے شل را ہم خراے دادہ
 کابل ماگس دعرش دفرش ص ۱۵۰

۱۹۴۵ء کے وسط میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور ان مہینوں
 کا آغاں ہوا جو جنگ کی جلوہ میں آتی ہیں یعنی اقتصادی اور معاشی بحران
 اور مالی غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔ لیکن بہر حال جنگ کے خاتمہ نے یہ تو
 سوچنے کا موقع دیا کہ آئندہ انسانی مفاد کے لیے کیا جاسکتا ہے انسان
 فرانس کے کمان فرمن میں اقوام متحدہ نے آنے والی دنیا کا خاکہ تیار کرنا شروع
 کیا۔ غلام ہندوستان کے نمائندوں نے بھی شرکت کی لیکن یہ ہندوستان
 کے نمائندے نہیں حکومت برطانیہ کے نمائندے تھے جو حق نے بھی اسے
 محسوس کیا اور چھوٹی سی ہنزی پر نظم لکھی ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ
 بین الاقوامی مسئلہ بن چکا تھا اس لیے انگلستان میں جیسے ہی حکومت
 برسرِ اقتدار آئی اسے اس مسئلہ کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ انگریزی سامراج
 نے مسئلہ سے دوسری جنگ عظیم تک کی مدت میں ہندوستان کی
 ادراصلحات کے مسئلے بہت سے وعدے کیے تھے اس لیے عام طور
 پر اس کی کسی پیشکش کو سنجیدہ حلقوں میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ بہر حال
 میں کوئی سیاسی بیج مقرر ہوتا تھا کوئی اسیا پہلو ہوتا تھا جس سے فرقہ دارانہ
 تعصبات خراب ہوں اور ترقی کی قوتوں پر چوٹ پڑے لیکن لڑائی نے بین الاقوامی

حالات بدل دیے تھے۔ ایسٹر گورنمنٹ کو اپنی "کیبنٹ" کے تین ممبر ہندوستان بھیجنے پڑے۔ ان کی طویل گفت و شنید اور پرانے تجربات کی بنا پر لوگوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ وقت گزری ہے چنانچہ جو شخص تے بھی ان کے جال سے بچنے کی تلقین کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشیدگی نہایت کو پہونچ چکی تھی۔ اب محسوس ہوتا تھا کہ یہ دونوں جماعتیں کسی بات پر متفق نہ ہوں گی، ہر سال ہندو مسلم شائقشہ کی شکل اختیار کر رہا تھا، یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہو کر رہے گا، لیکن مستقبل کا خاکہ واضح نہ تھا۔ زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن سانچہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ تہذیبی انداز ہی، لسانی، سیاسی، اقتصادی کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو عقائد، سیاسی سوچ بوجھ اور واداری کا مطالبہ کرتا ہو اور ان میں سے کسی پہلو کو جذبات سے الگ ہو کر مل کرنے کی کوشش نہ ہندو ہونا کر رہے تھے نہ مسلمان، لیکن جوش ایک شاعر ہونا کی حیثیت سے اتحاد ایک جہتی، رواداری کی تلقین کر رہے تھے۔

اٹھائے ندیم کر نگ جہاں بدل ڈالیں
زمین کو تازہ کریں، آسماں بدل ڈالیں
نظام وحدت اقوام کا ہے یہ منشور
کہ یہ تصور سود و زیاں بدل ڈالیں
یہ دلوں ہے تو آسب پہنچائے دوست
مزاج طغیانی ہندوستان بدل ڈالیں
اٹھائے ندیم۔ (دراپنہ ونگ من)

نویسنہ کیونٹ پارک سے تھے
عزق ہو جائے گی شیخ و رہمن کی برائی
جوئے اراج آخت کورواں ہونے تو دو

تم نے کاوش سے بنایا ہے بحریہ کوہ گراں
اک نفس ٹھہرا ہے آتش فشاں ہونے تو دو

”یلائے آزادی کو دہلیں بنا کر یوں پیش یہ تھا،
گوش بر آواز ہیں تو دار و بان ابلخ
ز محنت یک حرف تازہ ہے بہت شیریں سخن
اڑیں بلیغ محبت ہے نگاہ ناز کو
گامزن ہیں جاوہ نفرت پر شیخہ درمیں
دستخط کرے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم اے ماسک شرباب کھن
ٹوٹ جائے سجدہ و زنجار کا بند گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلف شکن اندر کھن
یلائے آزادی سے (سنبل و قلم اس میں ۱۲۶)

۱۹۴۵ء کے آخر میں جوشت نے ایک منظم دفعت کی آواز دیکھی جو ان
کے اس وقت کے خیالات کا بہتر دہنی ہے۔ بہت سے مہمان وطن کا خیال تھا
کہ ہندو مسلم کر مندو سنان کی قسمت کا فیصلہ کریں گے لیکن ہمتی سے یک
ادار کا انگریس کے رہنما کی بہت مشق ہوئی کہ اسے اس لگائے بیٹھے تھے۔ اپنا نظم
نشانہ فریب میں جوشت نے اس طرف اشارہ کیا تھا اس زمانے میں جوشت نے
دہارہ زبا عیاں لکھی ہیں جن میں اپنے خیال میں وہ حیات کی عقد کشائی کر رہے
تھے لیکن ان میں صرف فلسفہ اشارے ہیں جن میں کوئی مفہوم ترتیب
نظم نہیں ہے پس جہاں آزادی اور بہتر مستقبل کا سوال آتا ہے وہاں جوشت
کے خیالات میں وہی ابتدائی گہما گہما اور مبہم نظر آجاتی ہے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں

”مستقبل ہندوستان کے عزائم سے جو نظم نکلی ہے اس میں جو شش کی فکری
روایت اور اس کے فلسفہ کا پتہ چلتا ہے۔
کچھ ایسا آج گردوں کا سامن معلوم ہوتا ہے

کہ عکس آئینہ رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر

زمین کا ذرہ ذرہ پر نشان معلوم ہوتا ہے
اٹھایا ہے یہ کس نے چھٹ پٹے کا طرہ آئینہ

تسم کار و اں نہ کار و اں معلوم ہوتا ہے
اعدائے کہ جو شش اس صبح نو کی تازہ کاری میں

مجھے مستقبل ہندوستان معلوم ہوتا ہے۔

_____ مستقبل ہندوستان رسل و سلاسل

یوں جو شش ہندوستان کے مستقبل سے کبھی باورس نہیں ہوئے لیکن وہ ہندوستان
یہاؤں کے رویہ کی رازرہ نقد کرتے اور انھیں گویا یہ بتاتے رہے کہ ہندوستان
کا مستقبل اتحاد ہی کے ہاتھوں سنہرے سکتا ہے۔ پنجش ہونی نہیں چھینی ہوئی
آزادی حقیقی آزادی کہی جاسکتی ہے اسی لیے جب انگریزی سامراج کی بخشش
ہوئی عارضی تو ہی حکومت نے حلفِ وفاداری اٹھایا تو جو شش کی روح زخمی ہو گئی۔
جن لوگوں نے انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی تم کھائی تھی وہی انگریزی حکومت
سے وفادار رہنے کا قسم کھا رہے تھے۔ اس کی سیاسی ذہیت کیا تھی، اس
معاہدہ کا کیا مقصد تھا۔ جو شش کو اس سے سروکار نہ تھا تو یہ دیکھ رہے تھے کہ
رہنماؤں کا کردار بدل گیا ہے باغی وفادار بن رہے ہیں، تاج و تخت کو بھلانے
والے تاج و تخت کا طرف دہ رہے ہیں، ”رسل و سلاسل“ میں ان کی نظم
- عارضی حکومت کے حلفِ وفاداری پر دو بندھے - میں نہ صرف جبریت بلکہ قوم و غنہ
کا وہی جذباتی طوفان بہرہا ہے جو جو شش کی خصوصیت ہے۔

پھر ہندوستان پر کر آزاد ہوا، خون کا جو خراج برطانیہ کی طاقت سے
جگ کر کے دیا جاتا رہا آخر کار انہوں ہی دینا پڑا، لیکن خون کا اس طرح بہنا
عزت اور بہادری کی ہمیں یاد دلائی، وحشت اور انسانی انسان کی نشانی نکل
جنا پتہ جوتن نے جی کھول کے مذہب کے نام پر دکھائی ہونا دلیسری اور جوں
مردی کو اپنے پیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ آزادی کو انہوں نے دیوی بنا کر پوجا
لغا، جب وہ آئی تو جوتن نے خوشی میں اپنے وطن کا ساتھ دیا لیکن
یہاں آزادی کی خوشی میں یہ غرہ لگایا ہے

وطن کے روئے پاک پر ہے آٹ رنگ تیردی
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تو نگری
شکوہ بھر بند کا، مہا لیسر کی برتری
وطن کے حول، دھڑکن کی بھیری وادری
ہجوم در ہجوم ہے قطار در قطار ہے
پڑھو کہ نقش درنگ ہے اٹھو کہ نو بہار ہے

وہیں آزادی کے پردے میں چھپی ہوئی قصریت کو بھی دیکھا ہے
قال خون و جنگ ہے، جنرل جسر دت ہے
گر بے بات بات میں 'فساد شہر' ٹہر ہے
نفا پر نفس مرگ ہے زہی پر سوچا نہیں ہے
سپاہیوں کا زور ہے تباہیوں کی لہر ہے
کمان میں تیر جو ہے، کہیں میں ٹہرا ہے
خون نہیں گے پھر کے اگر بچا بہار ہے
برائیس بر رشتوں میں پگڑیاں یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں اور اس پر سینہ زوریاں

سبک گراں فروستیاں ذیل نفع خوریاں
 ادھر خلا ہے بھوک کا، ادھر بھری ہیں بویا
 نہ پیٹ میں نوالہ ہے نہ تن پہ ایک تار ہے
 خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

حقیقت کی اس تصویر نے انھیں بیدل نہیں کیا بلکہ آزادی اور بدحالی کے
 تضاد میں انھوں نے وہ راستہ دیکھا جو محض ایک رومانیت پسند نہیں
باعمل حقیقت پرست بھی دیکھتا ہے۔ سیاسی آزادی مل گئی ہے اب اسے
 حقیقی معاشی اور عوامی آزادی بنانا خود ہندوستان میں بسنے والوں کے
 ہاتھ میں ہے :

اشود بچپن کھل گیا، وہ منزل فراز کا
 وہ غزنوی کے قصر میں دیا حلا ایا ز کا
 سہرا ملا وہ عقدہ بائے گھوئے دراز کا
 تھن پر رنگ چھا گیا وہ چشم بزم باز کا
 رقیب غم نصیب ہے حبیب غم گار ہے
 بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے
 اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
 عارتوں کو پھونک کر، امارتوں کو ڈھائیں گے
 نشیب کو ابھار کر، سہراز کو جھکائیں گے
 سفینہ بحر نور میں غرور سے چلائیں گے
 اگر چاہے گرد و پیش آج سوچ مار ہے
 بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے
 ترانہ آزادی وطن (سرودہ فروزش ص ۲۴۱)

جوش کو یہ آزادی مکمل نہیں معلوم ہوئی کیونکہ ابھی اس خاکے میں بہت کچھ زنگ بھرتا تھا۔ ایک اختر کی سماج کی آرزو ان کے دل میں کر دیں گے رہی تھی، وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ارتقاء کی رفتار تیز ہو کر ہندوستان کو ایک نئی پسند جمہوریت میں تبدیل نہ کر دے بلکہ اس انسانی قوم کی ترقی کرے جس کا کوئی دین اور مذہب نہ ہو سب انسان ہوں۔

آزادی کے بعد ناقص آزادی کا احساس یا احساس یا قومی حیثیت سے پریشان حال عوام کر سکتے ہیں یا اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھنے والے ادیب اور شاعر۔ چنانچہ جوش نے اپنی اس دور کی نفلوں میں اس کی طرف براہ راست سے کہے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات پر جوش نے ہمیشہ زیر آغوش زلزلہ انگن اور طنز آمیز نظمیں لکھی ہیں اور تقسیم ہند کے بعد کے خونیں فسادات پر تو ان کا خون کھول اٹھا ہے۔

مہاتما گاندھی کا قتل، آزادی کے بعد کا سب سے اہم واقعہ ہے جس نے صرف ہندوستانی قوم کا سر بجا کر دیا بلکہ یہ بھی بنا دیا کہ قومی زندگی کس منزل میں ہے۔ جسے دیکھ کر جوش نے انھیں "ہند کے شاہ شہیدان" کہہ کر مخاطب کیا اور ایک اچھی نظم طویل نظم میں انھیں وہ خواب حقیقت پیش کیا جو ان کے قومی جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ ان کے شاہدے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو جس سے عام انسانی جذبات میں پہچان پیدا ہو، ان کی پسند نظر سے بچا کر نہیں جاسکا۔ چنانچہ گرانی کی ہولناکی، رشوت کی گرم بازاری، نشہ بندی کی سرکاری ہم آہمت پرستوں کی اردو دشمنی، آزادی خیال پر پابندی، کوئی پیسہ زائمی نہیں ہے جس نے جوش کے احساس شاعرانہ کو بیدار نہ کیا جو اور جس کے اظہار میں انھوں نے بے باکی اور آزاد خیالی سے کام نہ لیا ہو۔

اسی زمانے میں جوش ہندوستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے نکلنے

یہ دیکھ کر جوش نے انھیں "ہند کے شاہ شہیدان" کہہ کر مخاطب کیا اور ایک اچھی نظم

طویل نظم میں انھیں وہ خواب حقیقت پیش کیا جو ان کے قومی جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ ان کے شاہدے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو جس سے عام انسانی جذبات میں پہچان پیدا ہو، ان کی پسند نظر سے بچا کر نہیں جاسکا۔ چنانچہ گرانی کی ہولناکی، رشوت کی گرم بازاری، نشہ بندی کی سرکاری ہم آہمت پرستوں کی اردو دشمنی، آزادی خیال پر پابندی، کوئی پیسہ زائمی نہیں ہے جس نے جوش کے احساس شاعرانہ کو بیدار نہ کیا جو اور جس کے اظہار میں انھوں نے بے باکی اور آزاد خیالی سے کام نہ لیا ہو۔

یہ دیکھ کر جوش نے انھیں "ہند کے شاہ شہیدان" کہہ کر مخاطب کیا اور ایک اچھی نظم

دائے اور دوسرا آجکل (دھل) کے دراصل مفروضہ گئے اور ایک حیثیت سے
 سرکاری ملازمت کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی۔ اس نے ان کے افکار و خیالات
 کو کسی حد تک مصابیح کا یا سبند ضررہ بنا دیا لیکن اس کے باوجود
 انہی عہد میں انہوں نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں ان کی نخبہ کاری
 اور شاعری کے آب و رنگ اور ان کی شخصیت کے خط و خال کا نظارہ کیا
 جاسکتا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں بار بار کی پہلی پہلی تعلق آئینہ یاقین
 و ہلال گئی ہیں لیکن چند ایسی بھی ہیں جن میں جی کھول کر ملکی حکومت کی استوارانہ
 نوعیت اور اس کی غیر جمہوری سیاست کا پردہ چاک کیا ہے ترقی پسند
 قوتوں کو مجتمع ہو کر ایک ایسا زبردست اور آخری طوفان اٹھانے کی دعوت
 دی ہے جو ہمیشہ کے لیے انصافی، جبر، استحصال اور رجعت پرستی کا خاتمہ
 کر دے۔ "ماہنامہ آزادی" جو ۱۹۳۷ء میں نکھی گئی تھی لیکن جسے انہوں نے
 یہ تقاضائے احتیاط کی سال تک شائع نہیں کیا، ایسے ہی خیالات کی منظر پر
 ہے۔

خاموش ہیں طیو: چمن سرمہ در گلو شامیں سرورہ خوشہ انگوڑ زرد درو
 چھوٹوں کا نہیں ہے تنائے زنگ و زو بلبل کو آستیاں میں قفس کی ہے آرزو

خات گر بہار کا منہ چہ منہ لگے
 آئیں جو آندھیاں تو چن چھوٹے لگے

سرسبز سہی: نہ ساز نہ بلبل سبزہ زار بلبل نہ باغبان نہ بہاراں نہ برگ و بار
 جھونے نہ جام جم نہ جوانی نہ جہنم یار گلشن نہ گل بدن نہ گلانی نہ گل عذار

اب بولے گل و باد صبا مانگتے ہیں لوگ

وہ جس پر کر ٹوکی دے مانا گئے ہیں لوگ

فٹ پاتھ کا رخانے میں کھینچ لیا کرتے ہوئے رنجت اسگئے ہوتے مکان
بچے ہوئے یقین اسگئے ہوئے مکان ان سب اٹھ رہا ہے بنات کا پھر نہوا

شعلوں کے پیکروں سے پٹنے کی دیر ہے
آتش نشاں پہاڑ کے پٹنے کی دیر ہے

وہ نازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار وہ سنسنائی آگ وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ وہ غلطاں ہوا غبار لے بے خبر وہ آگ لگی آگ ہوتا رہا

بڑھتا ہوا افضا پر قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکا رہا ہوا

اس زمانے کی بعض نظموں میں ان کے قصہ آزادی کے ساز پورے شور کے
ساتھ نکل اٹھے ہیں اور دوا لیا احمد دگی جوان کے خیالات کی خصوصیت یہی
ہے برا برا اپنی جھلک دکھاتی رہی ہے۔ وہ بے پاؤں بڑھاپے کے آگے
بڑھتے آنے کا احساس، ناتدری پر جسمی صلابت اپنے ت عزائم اور شہر کی
عقائد کا اظہار آزادی کی خامیوں پر طنز، یہی موضوعات مختلف نظموں
میں جگہ پاتے رہے۔ "ترانہ آزادی وطن"، "استقلال میکہ"، "پند نامہ"
"در کس آدمیت"، "ساجات"، "رشتہ"، "ہمارے فراتین"، "اعتراف"
"عجز"، "تین مزید اس"، "بے چارگی"، "وہ نظمیں ہیں جو اس جذبہ کے
جوش کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن ان میں کسی خاص قسم کے ذہنی اور ثقافتی کا اندازہ

نہیں ہوا، ہاں کہیں کہیں پختگی خیال کی سبب بندگی ضرور نظر آتی ہے ۱۹۵۲ء
 اور ۱۹۵۳ء میں ان کے دو مجموعے "سرود و خودشن" اور "مکرم و مہمبا"
 دہلی سے شائع ہوئے ان سے جو ش کی ادبی اور شاعری عظمت میں کوئی
 نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ ان کے خالوں کی کمابست اس کی
 دل کی گنج بہت حد تک کھوج چکی تھی

تقریباً

ہندوستان کی ریاست میں پاکستان کا تذکرہ کئی سال سے اُرم
 تھا۔ جو ش نے مسلم لیگ کی ہمیشہ کنج جھٹی کی تھی اس لیے ان کے یہاں
 کبھی دو قروں والے قطر کا ذکر نہیں آیا۔ صرف ایک نظم "دلت کی آواز"
 میں انھوں نے ایک خاص انداز سے نفیم ہند کی حیات کی تھی لیکن جب
 ہندوستان نفیم ہو گیا تو جو ش نے اس پر واضح الفاظ میں کوئی اظہار
 خیال نہیں کیا معلوم نہیں ان کے دل و دماغ میں کیا باتیں گزر رہی تھیں
 لیکن ان کی نظروں میں ابھی خاص احتیاط کے ساتھ اس مسئلہ کو نظر انداز
 کیا گیا تھا حالانکہ جو ش عام طور سے ہر اہم مسئلہ کے متعلق اپنے
 فوری تاثرات کا اظہار نظموں کی شکل میں کرتے ہیں اور اس کا انتظار
 نہیں کرتے کہ واقعہ کی نوعیت ابھی طرح واضح ہوئے بہر حال تقریباً
 ۱۹۵۲ء تک وہ بالکل خاموش رہے۔ پھر شاعروں کے سلسلہ میں وہ
 پاکستان جانے لگے اور کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ وہاں
 زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔

۱۰۸

چونکہ اردو کے شاعر اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ان کی
 سب سے زیادہ شہرت اور عزت تھی اس لیے اسی درمیان میں حکومت
 نے انھیں وہ اعزاز بھی بخشا جو ہندوستان کے صرف چند بہتوں
 کو نصیب ہوا تھا یعنی انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب یا اعزاز سے
 سرفراز کیا گیا۔ ہندوستان کی سب سے اہم علمی اکہم سائنس اکیڈمی

کے رکن مفرد کیے گئے، ادب ظاہر وہاں باتوں سے خوش ہے لیکن خوش
باشی، تعیش، خواہش زرا در ابد قدردانی کے جذبات نہیں کہیں اور گھنچ
رہے تھے جاچکے انھوں نے آخر کار یہی طے کیا کہ وہ پاکستان میں جینا
اور مرنا پسند کریں گے۔ جوشن نے ہندوستان کو کیوں اور کس طرح
چھوڑا اس کی تاویل انہوں نے اپنے ایک مضمون ”ہجرت“ دئی
نہیں۔ حیدر آباد سندھ ۱۹۵۰ء میں کی ہے لیکن اس کی اصل
حیثیت سے ان کا سوانح نگار بحث کرے گا۔ یہاں صرف اس حقیقت
کا اظہار مقصود ہے۔

پاکستان کے دوران قیام میں جوشن نے کچھ مختصر نظمیں لکھ بائیں
اور چند طویل مذہبی نظمیں لکھی ہیں جس میں سے ایک طلوع فکر نام سے
۱۹۵۷ء میں شائع ہو گئی ہے۔ کچھ مضامین بھی شائع کئے ہیں لیکن
ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی یہ ”ہجرت“ ان کی سنا عرائف
اور ادبی زندگی کے لئے کس حد تک سازگار ثابت ہو گی اور انھوں نے
جو وقار و حیثیت ایک انسان کے کھویا ہے وہ بر حیثیت شاعر کے حاصل
کر سکیں گے یا نہیں۔

ذہنی ارتقار کی اس نقطہ کشی میں جوشن کی شخصیت کے خفا و خال
کمی نہ کسی حد تک بھرے ہیں لیکن چند سطروں میں انہیں اور نمایاں کر دینا
اس باب کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

جوشن کی شخصیت ان کے سنا عرائف انداز نظر کی طرح بیچ و خم
رکتی ہے وہ جب ان کے اشعار کے نقاب میں جھپ جاتی ہے تو گفتگو
میں ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو میں واضح نہیں ہوتی تو اشعار میں نمایاں ہوتی

لے یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

ہوتی ہے اس شخصیت کی تشکیں میں خود ان کی عمر کے تقریباً ساٹھ سال
 اور ان کی کئی بشتیں شریک ہیں اسے وقت کے تقاضوں نے سنوا دیا
 اور مختلف قسم کے اثرات و تصورات نے رنگ و روغن چڑھا دیے
 ہیں۔ جنوں و حکمت کی آمیزش، عقل و شہم نے ساز، بسکر و نشاط
 سے دستیگی، عرش و فرش کی سیر، بسف و بسو سے نخل و بھوم و بھیا
 سے دلچسپی اور حرف آخر کہنے کی آرزو نے جوش کی شخصیت کو بچیدہ
 تر بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح پھرنے والے
 شاعر اور وقت کی آواز پر کان دھر کر مسکر کے سامنے میں ڈھلنے
 کے آرزو مند فکر پسند انسان کی شخصیت ہے جو بے راہ روی اور
 اخلاقی اقدار و دوز کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں جو ش
 کی زندگی اور اطوار میں کلاسیک اور روایت، ہمیں راستوں اور نئی جستجوؤں
 کی خدمت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے کہ بعض اوقات مجموعہ اخلاقیات
 نظر آنے لگتی ہیں اور اسی تضاد کی پرچھائیاں ان کی شاعری اور افکار
 پر پڑنے لگتی ہیں اور پھر لطیف یہ ہے کہ وہ شخصیت بزم سخن میں کچھ اور
 ہوتی ہے اور بساطِ عمل پر کچھ اور۔ وہ ایک پروگرام بناتا ہے اور فلسفہ
 میں کھو جانے، زندگی و سرگستی میں وقت گزارنے، لب جات سے قصہ
 فوٹیں سننے اور تماشا سے لب بام دیکھنے کے اوقات مقرر کرنا چاہتی ہے
 ایسی شخصیت کے سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کی صبح و شام
 میں شریک ہونے، خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ وقت گزارنے اس
 کے ہمراہ خوشی اور غم کے لمحات بسر کرنے، اسے سوتے جاگتے، استراحت
 کرتے، اس کو دوستوں میں خوش مجلس کرتے اور سنجیدہ صحبتوں میں محبتیں
 چھیڑتے دیکھنے اور نیا دہندہ اور نمائے ناز برداری کی منزلوں سے
 گزرتے اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کوئی شخص ان کے اس پروگرام

کی طرف متوجہ کر کے کہ انھوں نے اپنا پتہ آپ بتا دیا ہے لیکن پردہ گرام
 بعض ان کے جسم کی تلاش میں مدد دیتا ہے، ان کی رُوح اور شخصیت
 اس میں نہیں ملتیں۔ یہ وہ جوش نہیں جوہ میں "کہہ کرہ کائنات" گرا
 بیٹا ہے اور اے اپنی انفرادی ذات کے گرد محیط کر لینا چاہتا ہے۔ انھیں
 اپنے تضاد کا خود احساس ہے ہے

جھکتا ہوں کبھی رنگِ رواں کی جانب
 اڑتا ہوں کبھی کاکبشاں کی جانب
 مجھ میں دو دل ہیں، ایک اہل ہز میں
 اور ایک کارُخ ہے آسماں کی جانب

لیکن اس تضاد میں وہ صورت نہیں ہے جسے انصاف کی زبان میں پارہ
 پارہ ہونا کہیں گے بلکہ یہاں شاعر کو اپنی ٹھہر جہتی اور آواز رنگاہ پارہ
 خزانے جس کا ذکر وہ بار بار کرتے رہے ہیں سنتا ہے

اے عریان کہنے دے دوستان تو اک وضع پر نہیں ہے سب دلوں کی رو
 کہہ کاؤر ہوں تو کبھی شکدے کی صو گرتی ہے گاہ برف نکلتی ہے گاہ تو

دریا ہوں اک مقام پر رہتا نہیں کبھی

اک خط مستقیم پر بہتا نہیں کبھی

وہ زبرد ہوں جس کی نہیں کوئی خاص لے وہ نالہ ہوں کہ ہو نہیں سکتا جو دفعے

مجھ میں ہیں ہے دہر کی ہر گرم و سردی زمر و زلال و زمزم و ذرا ب و ذندے

شاعر کا دل فقیر ہے اور کلبہ کا

سنگم ہوں اردو نائے جدید حر کا

جلال دہماں (سرود و خروش ص ۲۰۱)

جوشن آفریدی پمخافوں کے ایک بہت ہی خوشحال گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب انیسویں صدی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور خود امارت و قدرت کے قصوبات بدل رہے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ افغانی خاندان سرزمین اودھ کی ہواؤں میں پلا تھا، رنگینوں اور لطافتوں کی سرزمین! جوشن اسے کبھی نہیں بھولے کہ وہ افغانی ہیں، رئیس ابن رئیس اور صاحبِ سلف و قلم اجداد کے وارث ہیں! اب بھی جب کبھی جوشن کو پھیٹر دیا جائے اور ان کے بزرگوں کا ذکر شروع کر دیا جائے تو وہ مزے لے لے کر ان کے کردار کے انوکھے پن کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے دادا محمد احمد خاں کا ذکر کرتے ہیں یا اپنے نانا رستم علی خاں (بھرت پور) کا اپنے والد بشیر احمد خاں کا یا اپنے چچا امین خاں کا، ہر ایک کی زندگی ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کریتی ہے۔ بعض جہلیتوں سے یہ انوکھا پن ان کے کردار میں بھی ہے جسے حالات کے بدل جانے کے بعد بھی وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

جوشن کا کردار ایک ذہین، ذکی اور سرسٹیل انجین انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے لیکن مشابہات بالکل ذہنی اور عارضی طور پر جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لیے ساری صداقتیں رکھتا ہے اور وہ اُس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اس جذبہ کی شدت کی بنا پر کوئی طے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور طامعہ اس کے لیے استدلال بھی تلاش کر لیتی ہے رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں شدت جذبات اور سرسٹیل انجین نے جوشن میں بہت سے تضاد خاص پیدا کر دیے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لیے

جوش ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے۔ جو تفکر انھیں بچپن سے عزیز ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگا کر رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی نگو دیں پرورش پائی ہے مذہب، خدا، حیات، بعد موت، جبر و اختیار، مقصد حیات، علم انسان، عقل و عشق کے مقامات، ان تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین مضامین انداز میں ان کے بعض مقامات کو پیش بھی کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آمیزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو ناگزیر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو غل پر اکا کر خدا بننے اور کائنات کو تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ جوش میں عجیب طرح سے ایک بہت پرست اور بہت شکن کی رد و صیں مل گئی ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ

عفريت، جنيت، دلو، از در شيطان

در ديش: اقطاب، امام مرسل، يزدان

گيتي گر دوں، بہشت، دوزخ، اعراف

یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و تباں

جوش کا سینہ کتنے متضاد اور متضاد عناصر کی جولانگاہ ہے، کیا ان کی شخصیت اور کردار میں ان کا اظہار نہیں ہو گا۔ پھر کیا جوش کی شخصیت ایک پارہ پارہ بجا شخصیت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، ان کا ذہن جن تاثرات کو بھل کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیلی کارناموں میں فوراً ہو جاتا ہے چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔

یہ جیزان کے اقتاد مزاج سے ہم آہنگ ہے کہو کہ ان میں ناز برداری
 کے متمنی ایک عیش پسند کی رُوح ہے جس کا بچپن بچوں کی سبج پر
 گزرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راہیں زلفوں کے ساپہ
 میں گزاریں، جو اپنے حبِ توقع نہ میں بھر بھی ملک کی متاعِ عزیز بنے
 میں کامیاب ہوا۔ ان حالات میں اگر جوش کی شاعری ادا کردار کے سمجھنے
 میں اکھٹیں پیدا ہوئی تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۲۷ء کے قریب جوش
 نے اپنے ارتقاء کے ذہن کی منزلیں یوں پیش کی تھیں کہ
 اک زمانہ وہ بھی تھا اے دوستانِ کامیاب

ابرسا رہتا تھا میری رُوح پر چھایا ہوا
 طیشِ درہم دشمنی پر طیشِ آتا تھا مجھے
 غصہ انگاروں پہ راؤں میں ٹاتا تھا مجھے
 مڑتی تھی دشمنی جب دوستی کی سمت باگ
 میری افغانی رنگ و پے میں بھڑک اٹھی تھی آگ
 دیکھتا تھا آدمی کو جب ذیارت کا شکار
 اینٹھنے لگتی تھیں گردن کی رگیں بے اختیار
 دل یہ کہتا تھا کہ ہر سینے میں خنجر بھونک دوں
 خلق کو بھڑکے ہوئے دوزخ کے اندر جھونک دوں

لیکن اس مدت میں جب باغ ہوئی میری چتا
 ہنکھ چھکانے لگے دل میں رموزِ کائنات
 دیکھتا کیا ہوں کہ ماحولِ دواشت کا جو
 نوعِ انساں کے سبک شانے پہ ہے رکھا ہوا

نظرت و طیفیتِ شرب در بیت طبع و ضمیر
 ایک انسان اور اسے بند خانوں کا اسیر
 کیا جہالت تھی کہ کھانا تھا بشر پر بیچ و باب
 حد ہے اس معصوم کو دینا تھا عجز کا خطاب
 جس کے انسانے کا ہے عنوان آدم کا بہو
 جس کی بیشائی پہ ہیں جبرِ شیت کے خطوط
 بھول انکاروں پہ راتوں کو ٹاتا تھا مجھے
 حیف اس مظلومیت پر تا دُ آتا تھا مجھے

اب مرا غیظ و غضب اپنے سے شرانے لگا
 مجھ کو انسان کے گناہوں پر ترس آنے لگا
 بھید بانا تھا کہ دل سے غیظ کم ہونے لگا
 آدمی کی بے نوائی دیکھ کر روتے لگا
 اور جب اس سے بھی کچھ گہری نظر جانے لگی
 مجھ کو انسان کی خطا اس پر مہیسی آنے لگی
 بیقراری کے عوض دل کو قرار آنے لگا
 نوعِ انسانی کی گمراہی پہ پیار آنے لگا
 اک نیا احساس اس سینے میں اب پاتا ہوں میں
 دشمن کرتے ہیں دشمن اور گھبراتا ہوں میں
 بے کس و مجبور انسان کو دے دیتا ہوں میں
 وار کرتا ہے کوئی تو سکر دیتا ہوں میں
 بلوغِ حیات (مکر و نشاط ص ۱۱۰)

مفروض جبر کے عقیدے کے ماتحت خیالوں میں یہ تغیرات، منکر کے
تقابل میں تحلیل کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہی عقیدہ تضاد کے لئے ان کی پکار
کامیاب ہے مختصر یہ کہ جو شمس کی شاعری اُن کے ذہنی ارتقا کا آئینہ ہے۔ اُن کی شاعری
اُن کی شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبح اور طبعی و پسندی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی
ہے۔ اُن کی ذہنی کشمکش، فکری و ایمانی، تصور پرستی، سماجی عقائد ہر ایک کی جھلک
اُن کی ہزار ہا نظروں میں بکھری پڑی ہے۔

ان کی شخصیت میں جو نزاعیں بانگیں ہیں وہ روایت اور نفاذ کی
کشمکش سے پیدا ہوا ہے لیکن وہ روحانیت اور تصوف سے مادیت
اور حقیقت کی طرف، تقدیر پرستی سے جبر کی طرف اور جنوں سے حکمت کی
طرف بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ادبیہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ جو شمس
کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی شاعری کھوکھلی اور سطحی ہے،
یاد دہانی عنصر کی زیادتی نے فکری عنصر کو ان کی شاعری میں بالکل ختم کر دیا ہے۔
ان کی تنقید ہو سکتی ہے، انھیں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ آئندہ ابواب میں ان
کے فکری اور فنی تصورات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

۲۔ نظریہ شاعری

اگر جوش کے نظریہ شاعری پر شروع ہی میں غور کیا جائے تو آگے بڑھ کر ان کے افکار و خیالات اور شعور و فن کے متعلق رائے قائم کرنے میں آسانی ملے گی۔ کیونکہ اسی میں ان کے اُس جہالتی اور تصوراتی اندازِ نظر کا سراغ ملے گا جس نے تخلیقی عمل کی منزلوں میں ان کے لیے رہنما اور سہارا کا کام دیا ہے۔ یہ نظریہ بھی عام تصویرِ حیات اور احساسِ فن کا ایک جز ہوتا ہے جو ارتقاءِ ذہن کے ساتھ وجود میں آتا ہے اور ان تاریخی اور مادی حالات کا تابع ہوتا ہے جن سے ذہن کو سماجی دائرے کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے واسطہ بڑا ہے۔

ہر شاعر نے یہ بات ضروری نہیں سمجھی کہ نفسِ شریانی شریکوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق نظم و نشر میں اپنے خیالات کا اظہار کر لے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شعر کے حسن و قبح، اسلوب اور اندازِ اسلوب اور موضوع کے متعلق اس نے جو کچھ کہا وہ مکمل طور پر اس کی شاعری پر بھی صادق آتا ہو یا شعوری طور پر اس نے اس کا پیروی کی ہو تاہم جب

لے اس باب میں اپنے ہی ایک مضمون "جوش کا نظریہ شاعری" مطبوعہ شاہراہِ وصل جہڑی فردی ۱۹۵۴ء سے مدون کیا ہے۔

کبھی کسی شاعر کی یہاں شاعری کے اصول اور فن کے متعلق رائے ملتی ہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھیں یکسر نظر انداز کر کے اس کی شاعری پر گفتگو کی جائے۔ ممکن ہے وہ خود اپنے اصولوں کا پابند نہ رہ سکا ہو یا قول اور عمل میں مطابقت سے قاصر رہا ہو یا اپنے خیال میں وہ نظریہ سے مطابقت پیدا کر لیتا ہو لیکن دوسرے اسے نہ سمجھ سکتے ہوں پھر بھی اس طرح کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کی کوشش سعی رائیگاں نہیں کہی جاسکتی بلاشبہ اور تحت الشوری نفسیات کے ماننے والے بعض انتہا پسند ناقد اور سخن فہم اس بات پر اصرار کریں گے کہ یہ طریق کار بے سود ہے کیونکہ فن کار اور شاعر جاننا ہی نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے لیکن اس وقت اس پہلو سے بحث نہیں بحث صرف اس سے ہے کہ اگر کوئی شاعر فن شری یا موضوع شاعری کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اسے "زادِ درونِ خانہ" سمجھ کر اجمیت دینا ضروری ہے۔ جو سینے فن کی آگ میں چنے رہے ہیں اور جو دلِ تخلیق کی لگن میں دھڑکتے رہے ہیں ان کی آواز میں کچھ نہ کچھ وزن و رفتار ضرور ہو گا حالانکہ یہ بھی درست نہ ہو گا کہ غور و فکر کے بغیر اس آواز کو "غلط آہنگ" نہ سمجھ کر ہمیشہ قبول کر لیا جائے۔ اقبال نے اپنے دو شعروں میں اس حقیقت کی خوب اشارہ کیا ہے

صاحبِ حاذق کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہ گاہ غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اور

کرمِ شبِ تاب است شاعرِ دشتستان وجود
در پر دبا ششِ فروغ گاہِ ست و گاہِ نیست

کبھی کبھی غلط آہنگ ہو جانے اور کبھی کبھی پر وبال کے بے فروغ ہو جانے کی

صورت ایک پیچیدہ نفسیاتی عقدہ ہے جس کے سلجھانے کے لئے کسی شاعر کے مزاج اور شعور کی تشکیل کرنے والے تمام کوفوں کا جھانکنا ضروری ہو گا۔ جس طرح خیال کے اظہار میں غلطی ہوتی ہے اسی طرح جذبہ کے اظہار میں بھی ہو سکتی ہے، یہی نہیں طرز اظہار بھی غلط یا نامناسب ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے شاعر اور شاعری کی تنقید ایک بامعنی بات بنتی ہے۔ ورنہ بعض شاعروں اور ان کے ہم نوا ناقدوں کا تو خیال ہے کہ شعر و شاعر کی تنقید تو ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ مسئلہ شاعروں اور نقادوں دونوں کے نقطہ نظر سے برابر زیر بحث آچکا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس لیے الجھن پیدا کی ہے کہ لوگوں نے دونوں کے دائرہ شعور کو بالکل الگ الگ سمجھ لیا ہے حالانکہ مندرجہ نقطہ نظر اور اختلاف شعور کا نہیں، طریق کار کا ہوتا ہے۔ شاعر اور ناقد ہر ایک دوسرے کی دنیا میں داخل ہوتے رہتے ہیں، دونوں فن اور حیثیت کے بعض اصولوں، تاثر اور تاثیر کے بعض پہلوؤں، جان بوجھ کر دنیا کے بعض تجربوں کا ادراک اور احساس رکھتے ہیں اور شاید رہیں۔ اختلاف عقائد، شاعری سے ایک ہی کام لینا چاہتے ہیں۔

ان مہمیدی سطور کا مقصد یہ ہے کہ شاعر، شاعر اور ناقد کے متعلق اور ناقد، ناقد اور شاعر کے متعلق اسی اشتراک کی بنیاد پر رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ جیسے ناقد اور ناقد کے درمیان ادب کی برکت کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے یا شاعر اور شاعر فن کے متعلق مختلف نظریات کے حامل ہو سکتے ہیں اسی طرح شاعر اور ناقد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہ اختلاف فن اور مواد دونوں کے متعلق ہو سکتا ہے اس لئے اس "کاروبار ادب" میں بڑی وسعت ہے اور اس کی جانب بھی وسیع النظری کی بنیاد پر ہو سکے گی۔ یہ وسیع النظری محض ذوق اور وجدان سے نہیں علم و آگہی سے

پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر شاعری کے متعلق کوئی رائے دیتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہوں گی جو نائد کی ہوتی ہیں۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس وقت جوش کے بعض خیالات سے بحث مقصود ہے اور وہ بھی اس لیے کر آئندہ ان کے تصورات کے کچھ میں آسانی ہو۔

کوئی انہیں پسند کرے یا نا پسند، جو شے موجودہ دور کے بہت ہی اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری اور زندگی کو ایک دوسرے قریب لانے اور خیالات اور جذبات کو اعلیٰ شاعرانہ اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے خیالات کی دنیا وسیع اور جذبات کی دنیا رنگین اور پُر شور ہے جنہیں انہوں نے طرح طرح کے آب و رنگ اور سایہ و نور کے صیگوں میں ڈھالا ہے اور نظم و نثر میں برابریہ ظاہر کیا ہے کہ خیالی زبان، اسلوب اور اظہار کے باہمی تعلق کے متعلق وہ کچھ خیالات رکھتے ہیں۔ اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہیں جنہوں نے شاعری کے متعلق مختلف پہلوؤں سے، اتنا کہا ہے جتنا جوش نے۔ اگر کسی قسم کا تجزیہ یا تبصرہ کرنے کے بجائے ان کی تحریروں سے صرف ضروری اقتباسات کیجا کر دیے جائیں تو وہی بہت کچھ کہہ جائیں گے۔ کچھ مقامات پر شاعر اور شاعری کے متعلق محض اشارے ہیں، کچھ نظموں میں انہیں کستری یا برزی نے قتل آئینہ انداز زبان کی صدمت اختیار کر لی ہے، جس سے کوئی اہم نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ "شاعر ہندوستان" "علاموں سے خطاب" "نقاد" "بارگاہ شری" "آواز شاعر" "شاعر اور میڈیا" "شاعر کا دل" "دنیا اور شاعر" "عالم اور شاعر" "غزل گوئی" "شکر کی آگ" "شاعر کی بخشش" "شاعر و خدا" "شاعر کا ابشار" "جلال و جمال"۔

یہ ساری نظمیں اس مطالعہ میں کام آ سکتی ہیں حالانکہ بہت احتیاط سے

جہاں مخاطب کو ان میں سے وہ حصہ نکالنا ہو گا جو مفید ثابت ہو۔ ان کے علاوہ نہ جائے سنی رہا عیوں میں، کتنی کتابوں کے قارئین دُعا چوں اور تقدسوں میں، کتنے مضامین میں یہ خیالات کھڑے ہوئے ہیں، اکثر یہ خیالات ایسے شاعرانہ، جذباتی اور وجدانی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں کہ ان کی حقیقت تک پہنچنا ذہن و نظر کا امتحان ہے۔ کہیں کہیں فخریہ اور جزیریہ انداز میں شاعر کے منصب کا بیان حقیقتی کا مظہر ہے۔ ان نظموں میں خیالات کا بارہ جذبات کے بھان کے مطابق جڑ تھا اور اترتا ہے اور اکثر کسی عارضی تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں یہ خیال ملتا ہے کہ شاعری بیخبری ہے۔ وہیں یہ خیال بھی موجود ہے۔ کہ شاعری عرش کی بازی گری یعنی بیخبری نہیں ہے۔ اوپر دیے ہوئے عنوان آتے ہیں اسے اندازہ ہو جائے گا کہ زیادہ تر نظمیں شاعر کے مرتبہ سے متعلق ہیں ان میں فنِ شریکوں یا خصوصیاتِ شاعری سے بحث نہیں کی گئی ہے جو فن نے اس مسئلہ پر جو کچھ بھی لکھا ہے اگرچہ اس میں شعر کی اہمیت، موضوع اور مواد، فلسفہ شاعری، اسلوب اور طرزِ اظہار کے متعلق مربوط خیالات نہیں ملنے لیکن حسبِ ذیل مسائل میں نہ کسی شکل میں برابر دعوتِ فکر دیتے رہے ہیں۔

۱۔ شرا و شاعری سے کیا مراد ہے؟ اور شاعری کی خصوصیات

ہیں؟
۲۔ شاعر کس حد تک احوال سے متاثر ہوتا ہے؟ کس حد تک

اپنے وقت سے آگے ہوتا ہے؟

۳۔ لفظ اور معنی، موضوع اور ہیئت میں کیا تعلق ہے؟

۴۔ شاعر خود کھلائی کرتا ہے یا کسی گروہ اور طبقہ کو متاثر

کرنے کے لیے کہتا ہے؟

۵۔ شاعر اور شاعری کی تنقید ممکن ہے یا نہیں ؟

۶۔ کیا ان مباحث کے بعد کوئی نظریہ شاعری، کوئی ادبی

نقطہ نظر وجود میں آ سکتا ہے ؟

سُور کیا ہے ؟ مختلف ان خیال لوگوں نے اس کی مختلف تعبیریں اور

تعبیریں پیش کی ہیں۔ ہوش نے اپنے ایک مضمون "غزل گوئی" میں

"شاعری کیا ہے ؟" کے ذیل میں شاعری اور زندگی کے تعلق سے بحث

کی ہے اور ساتھ ہی اس علمی تخلیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے گور

کو ایک نظم نظم بنتی ہے۔ لکھتے ہیں :

— "یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن

انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ شعوری

و غیر شعوری طور پر نوع انسانی کے افعال

و افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا

کرتے ہیں لیکن جب شاعر نے قلب پر یہی

اثرات پڑنے میں تو ان کی کیفیت درست

ہی کچھ ادا ہوئی ہے۔ تو بول اور بادلوں کے

گرجنے سے غیر شاعر بردہ اثر نہیں پڑتا

جو عینک کے نال پر ایک ذرے کے گرنے

سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ

خواہ دیکھنے میں آتا ہی حقیقہ ہو جو شاعر

کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر اثر جو

شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے خون میں

شامل ہو کر اس کے شرائیں میں سرایت کر جاتا

ہے اور اس کے مشعل سینے میں اس وقت تک

نثر و شاعری

[illegible]

نیا عری چاہتا ہے کہ بیٹی ہے وہاں جنگ
بیٹی بھی ہے عری اگر بیٹی ہے تو خارجی بھی
ہے۔ اس لئے کہ وہ عری کو خارجی کے معنی میں
اور راہنے کے ساتھ نویسی کا لقب سے تو دور
یہ حقیقت ہے بعد از مرگائے ۔

اس کے بعد شاعر کے متعلق بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور اگر ان سطروں کو بہ غور پڑھا جائے تو جہاں دل چپ شائع نکلیں گے جو تصور پرستی اور حقیقت پسندی کی آمیزش ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ان خیالوں کا جائزہ لینے سے پہلے کچھ اور۔
 ایک اور مضمون "ہمارے شاعر میں یہ جملے ملتے ہیں :

— شکرِ بنیادِ لا محدود ہے اور عالمگیر
 محبت پر ہے۔ "شر ایک ازلِ عکس ہے"
 "یہ تو کب معلوم عوامِ حد تک ان ہونی بات ہے
 کہ شکر اور ایک ذوقی اور وجدانی تھے ہے۔
 یہ کوئی مادی چیز تو ہے نہیں کہ ہم اسے چکھ یا
 چھو سکیں۔ یہ کوئی نگینہ بھی نہیں ہے کہ ہل بھر
 میں وزن معلوم کر لیا۔۔۔"

جو شمس کے راہنشاہ زیادہ تر تمذہبِ حنائی سے نفی پاب ہے اس کے راستے کی شمع روحِ انیس کی سانس ہے جس کے قلب پر حسنِ ازل کی نیرِ بڑی رہتی ہے جس کے دل پر لہام کی بارش ہوتی رہتی ہے اور طائرِ مکرہ جس کا ہم قیصرِ سج تاسے۔

ان انبیاءات میں شعر، تخلیقِ شاعر اور شاعر کے متعلق رسمی اور فرسودہ خیالات کے باوجود ایسی اہم باتیں کہی گئی ہیں جو ہمیشہ موضوعِ بحث رہی ہے اور جو غور و فکر کی ایک منزل پر فلسفۂ شاعری کا جزدِ مبنی ہیں۔ ان سطروں میں تجربہ کی مادی نوعیت اس سے اثر پذیر رہی اور اس کے اظہار میں شاعر کے طریقہ کار کا تذکرہ ہے۔ ایک حیثیت سے فن کے بھی مدارج ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تجربہ حاصل کرنا کی منزل سے بے گرا اس کے جذباتی اور فنی اظہار اور مقصدِ اظہار تک کی منزل میں فن اور مقصد کے مابین

اہم مدارج آجاتے ہیں لیکن شاعر کے طبع میں یا فوق الفطرت مخلوق ہونے سے کر سائنے آنے کی وجہ سے عام انسان اور شاعر کے درمیان اقسام و تفہیم کی خلیج وسیع تر ہو جاتی ہے۔ یہ عینیت کی منزل ہے اس کے برعکس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دیکھتا ہے اور اپنے حواسِ حسہ کی مدد سے ان حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے، اس سے اس کے جذبات میں ہيجان پیدا ہوتا ہے اور ہيجان اسے شکر کہنے یا اظہارِ خیال پر مجبور کرتا ہے۔ شاعر کا احساسِ فن مناسب الفاظ اور موزوں کلموں کا انتخاب کر کے انھیں فن پاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جذبات اور خیالات کی اس ترسیل میں شاعر کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی ناکام۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جوش ایک حقیقت پسندانہ اور عقلی نقطہ نظر اختیار کر رہے ہیں لیکن کیا وہ اس پر قائم رہتے ہیں؟ شاعر خیال اور عقیدے کی جذباتی ترسیل ہے، وزن اور لفظ کے سانچوں میں ڈھل کر۔ یہی جذباتی صداقت شرمینتی ہے اور ہمیں شاعر کو فن کے سب سے نادرک مرحلہ سے واسطہ پڑتا ہے۔

جوش نے شاعروں کو "حیات کی مصوری" اور "زمانے کی تاریخ نویسی" کہا ہے۔ گویا وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شاعری میں مواد اور موضوع کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور شاعر کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ انھیں "موزوں ترین جامہ الفاظ پہنانے کی صلاحیت اور قدرت بھی رکھتا ہو"۔ لیکن ان کی نصورت انھیں اس خیال پر بھی مجبور کرتی ہے کہ ترسیل اور اظہار ممکن نہیں ہے۔ اظہار کے لیے زبان اور لوازمِ فن سے واقفیت ضروری ہے، جوش کہتے ہیں کہ زبان میں شدتِ جذبات کو ظاہر کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔ ان کی ایک اہم نغم "نقاد" غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے ہارسش بے شمار
 نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
 دُعا لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیب ادب
 دُھل کے گودہ گوہر غلطاں کا باقی ہیں لعب
 اور ہوتی ہیں تجسلی بخشش تارِ زرخشاں
 پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیبیاں
 جن کے سراو درخشاں رُوح کی مغل میں ہیں
 سیبیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موقی دل میں ہیں
 شاعری کا خانماں ہے نطق کا ٹوٹا ہوا
 اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
 چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سرشار پر
 ٹوٹ کر آنے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
 جا گئے رہتے ہیں دل کی مغل خاموش میں
 بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں
 لوگ جن کی جا نگہ ازی سے ہیں دل پر کھم ہوئے
 کھو کھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
 اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی آہ
 "شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات
 "شعر" کیا؟ جذبِ درون کا اک نقش نامقام
 شبہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام
 کیف میں اک نغمہ بخش پا کلب گوہر بار کی
 اضطرابی ایک جنبش سے لبِ گفتار کی
 ایک صحتِ خستہ و مہوم سا زودق کی

مرقس کی ایک آواز انتہائے شوق کی
 بے حقیقت نے کے اندر زمرہ داؤد کا
 عارض محدود پر اک عکس لا محدود کا
 جوئے قدرت کی روانی دشت مصنوعات میں
 ٹوٹنا رنگین ستارے کا اندھیری بات میں
 شرکیا؟ کچھ سوچا دل میں یہ لمن دل نشیں
 شرکیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقین
 شرکیا ہے؟ نیم بیداری میں پہنا مون کا
 بگ گل پر بند میں شبنم کے گرنے کی صدا
ترابی اور خاموشی کی تبسم گفتگو
لفظ و معنی میں توازن کی نہ ہفت آواز
 بادلوں سے ماہ نو کی اک اچھٹی سی ضیا
 جہانکا قطرے کے روذن سے عروس بھر کا

یہ کہہ بنا آسان ہے کہ جوشش کی شاعری محض کھوکھلی مغرہ بازی ہے
 اور ان کا تفکر بے بنیاد ہے لیکن جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کی بنیاد
 پر ان کے خیالوں کی حقیقت پر غور کرنا محض اہم ترین مسائل سے دوچار
 کرتا ہے مثلاً کسی خیال یا تجربہ کی بنیاد پر جذبہ کا پسہ اہونا جذبہ کی شدت
 اظہار کی کوشش، مشکل اظہار میں زبان اور الفاظ کی ناکامی شاعر کو ان
 مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جذبہ دل ہی کے اندر شرکی صورت
 اختیار کر لیتا ہے، باہر آتے آتے ایک ناقص بے رنگ اور بے کیف کی چیز
 ہو کر رہ جاتا ہے جسے دنیا تو شر کہتی ہے لیکن شاعر جانتا ہے کہ یہ شکر
 نہیں ہیں

یہ بایں بہت سے سوالات پیدا کرتی ہیں۔ کیا کسی خاص شاعر کی زبان یا کوئی خاص زبان اظہار جذبات میں ناکام رہتی ہے یا تمام شاعروں یا تمام زبانوں اور تمام جذبات کا یہی حال ہے۔ اگر کسی ایک شاعر یا چند شاعروں کا یہ معاملہ ہے تو اسے تو بہت اظہار کی ناکامی کہہ سکتے ہیں اگر عالمگیر ہے تو لفظ اور معنی، زبان اور خیال، جذبہ اور اظہار میں کوئی رشتہ ہی قائم نہ ہو گا یا اگر ہو گا بھی تو بہت ناقص اور نامکمل۔ ایک حد تک تو بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ بعض اوقات الفاظ جذبات کا ساتھ نہیں دیتے اور الفاظ میں جادو بھرنے کے لئے 'اشاروں، کنایوں، علامتوں، تشبیہوں' اور استعاروں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اگر تجربہ اور اظہار میں وہ بعد ہر جس کا احساس جوش کو ہے تو پھر سارے فنون لطیفہ اور خاص کر شاعری کے متعلق نئے سرے سے غور کرنا پڑے گا کیونکہ جب الفاظ جذبات کا ساتھ ہی نہیں دے سکیں گے تو اظہار کی ساری کوششیں بیکار ہو گئی کیونکہ جب الفاظ جذبات کا ساتھ ہی نہیں دے سکیں گے تو اظہار کی ساری کوششیں بیکار ہو گئی اور شاعر کبھی یہ ظاہر نہ کر سکے گا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا، یہ جذبہ گوئی کا خواب ہو گا جسے دوسروں تک پہنچانا ناممکن ہو گا۔ اس طرح تخلیق شکر کی منطق جو شمس کو دیاں لے گئی جہاں مشہور اٹالوی فلسفی اور مفکر کو دے دوسری راہوں سے پہنچا تھا یعنی شہرہ ہے جو شاعر کے دل میں ہے۔ اصل شرا اظہار کا محتاج نہیں، اس کی تکمیل اس وقت اندر ہی اندر ہو گئی جب وہ لوح دل پر نقش ہوا، جو ابھر آیا وہ کچھ بھی نہیں، بلکہ بقول جوش نطق شاعری کے خانہاں کو لوٹ لیتا ہے اور شاعری کی شراب جام میا آتے آتے اڑ جاتی ہے موتی دل کے اندر رہ جاتے ہیں سیسی سننے اور پڑھنے والوں کو ماتھ لگتی ہے بالآخر آمیزی سے قطع نظر، جوش نے ایک محاذ سے یہ نظریہ پیش کیا ہے

کو حفظ اور معنی میں کوئی حقیقی قلم کار نہیں ہو سکتا، اس طرح شاعر اور
دوسرے لوگوں میں جو رشتہ قائم ہو گا وہ برائے نام ہو گا اور شاعر کی
حیات کی مسودہ اور زمانے کی تاریخ نویسی کی کوشش بے معنی اور بے
حقیقت ہوگی۔

یہ نظم جو شاعر نے ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی جب ان کی عمر تیس سال سے
بھی کم تھی لیکن جہاں تک بعد کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے
بنیادی طور پر ان کے خیالات نہیں بدلے، خیالی طور پر ضرور بعض قسم کی
ترمیمیں ہوتی رہیں۔ ابتدا میں انھیں یہ خیال نہیں تھا کہ ان کی شاعری
آگے چل کر قومی جذبات، سیاسی اور معاشی میلانات کی ترجمان بن
جائے گی اس لئے شاعری محض شاعری تھی، تفسیر حیات نہیں تھی۔ جب
قومی جدوجہد اور مقتضائے وقت نے ادھر بھی متوجہ کیا تو انھوں نے
ادب اور شاعری میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا اور اپنے عہد کے
ادیبوں اور شاعروں سے کہا کہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری
کا خون دوڑائیے اور ہندوستان کو عظیم ترین بنانے کے لئے دل و جان
کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیجئے۔ انھوں نے شاعروں کو یہ بھی یاد دلایا:

— ایک صبح جنبشِ قلم ستر سزار بر سر تلواروں

کے مقابلے میں زیادہ کار آمد آلہ جنگ

— ہے

۱۹۲۴ء کی بات ہے جب آزادی کی جدوجہد تیز تھی اور ترقی پسند
ادبی تحریک شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی، یوں
بھی اکثر مقامات پر جو شاعر کے ماحول سے متاثر ہونے
اور اس تاثر کے ظاہر کرنے کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر
یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعر کی نگاہ مستقبل میں درآتی ہے اور ان

باتوں کا ذکر کرتی ہے جس سے دوسرے واقف نہیں۔ قلمی کے انداز میں یہ
جذر بار بار ظاہر ہو رہے ہیں۔

اے گاز جانے کب زانا اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فنا اپنا
صد حیف کہ قدرت سے لاپرواہی
قدرت کو سنائے جا ترا اپنا

منظف ہوں مگر وارثِ فطرت ہوں میں
ہمسرا پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحہ موجود ادب سے پیش آ
اسندہ زمانے کی انت ہوں میں

اک عمر سے نہر لپ رہا ہوں اے دوست
سینے کے شگاف سے رہا ہوں اے دوست
گویا سہ کہ ہمارا تنہا پودا
یوں اپنے وطن میں جمی رہا ہوں اے دوست

شاعری میں موضوع اور مہیت یعنی خیال اور بیان کے تعلق کا مسئلہ
بہت ہی پیچیدہ ہے۔

جوش کے متضاد خیالات کی وجہ سے ان کے نقطہ نظر کے سمجھنے میں
اور دشواری پیش آتی ہے۔ ایک جانب وہ وزن و شعر کی منزل میں جرات
دل انسان لانے کے متمنی ہیں دوسری طرف شاعری میں بیان ہی کو سبک
سمجھنے پر مقرر ہیں۔ ایک طرف شاعر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ شاعری کے ذریعہ

ذہنی انقلاب کا سامان ہم پہنچا ہے۔ دوسری طرف اسے اظہار خیال کا بے روک ٹوک آزادی دینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں شریعت اور نقد کے بعض اہم مسائل سامنے آتے ہیں۔ کیا شاعری کا کام تعلیم، تلمیذین، صلاح یا تنظیم جذبات ہے یا محض لطف، مسرت اور حظ کی ایک لطیف فضا پیدا کر دینا؟ کیا یہ فضا بھی تنظیم جذبات یا تہذیب ذوق میں متین نہیں ہوتی؟ کیا اظہار خیال میں کوئی ایسی منزل نہیں آتی جہاں شاعر "ہمہ" بنے کا آرزو نہ ہو؟ جو شش ان میں سے ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے دیتے ہیں لیکن ان کے متضاد بیانات سے اس کا اثر ذہل ہو جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں :

— شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے، حیات کے ہر تھوڑے حواس اور مادے، حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں تر میں جامع الفاظ پہنانے کی صلاحیت و قدرت بھی رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شاعر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک طرح کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ تو قرآن کی زبان میں ہر آن نئی نئی دادوں کی سیر کیا کرتا ہے وہ تو ہواؤں کی طسرح آوارہ، ابر کی طسرح بے پروا خرام، نصوات کی طسرح بے نید، بند اور ایچھر کی طسرح آزاد

ہوتا ہے۔

وہ کہیں ٹھہر بھی کیڑ کر سکتا ہے ۔۔۔ اس
کے سر دتواتنے ناقابلِ شمار فرائض ہوتے ہیں کہ وہ
منزل پر ٹھہری نہیں سکتا۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی
حالانکہ ہر منزل اس کی ہے ۔۔۔ وہ تو اپنے مشاغل کی نزاعی
باعت گھبرا بگاھرا یا سارہنسا ہے ، وہ کیا کرے اور
کیا نہ کرے کسی فریضے کو انجام دے اور کسے
ملتی کرے ۔۔۔ ۔۔۔

شاعر کے کلام سے آپ اس کے مزاج کی افتاد اس کے احباب اور
خاندان کا سوا اس کی زندگی کے مختلف واقعات معلوم کر سکتے ہیں۔ بالظاہر
دیگر اس کا کلام اس کی ایک نوجوانی بیباک رانی (سوانح عمری) ہوتا ہے اور
حسرت یہیں تک نہیں، آپ کو اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس
کے زمانے کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ اس کے دور میں عام پبلک خیالات
کی کیا نوعیت تھی، اس وقت کے معاشرے، مذہبی اور سیاسی اشیاء (۹)
کیا تھے اور اس کے ہم عصروں کی ذہنیوں کا رخ بالعموم کس طرف تھا۔
اگر الفاظ کے کچھ معنی ہوتے ہیں تو ان خیالات کا پیش کرنے کا کبھی شاعر
اور نقادوں کے ساتھ محسوس نہیں کیا جاسکتا جو شاعری کو محض شاعر کے
دل کی آواز یا محض بیان سمجھتے ہیں، شاعری ان کے نقطہ نظر سے حیات کی
ترجمانی ہے محض لفظی شعبہ بازی نہیں لیکن جب سے ان کے بعض دوسرے
خیالات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو عجیبے نتائج برآمد ہوتے ہیں شاعر

کی تراجمی آزادی، جبر کا عقیدہ، رومانی شدت، جذبات سب ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں اور جوشش کا نظریہ شاعری پریشان خیالی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے شکستِ دماغ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں انھوں نے ان شعراء پر اعتراض کیا ہے، بلکہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں ان کا مذاق اڑایا جو بعض دوسرے اور چپقلے کے موضوع پر نظمیں لکھتے ہیں اور جن کا کلام اغلاطِ زبان و بیان سے پر ہوتا ہے۔ اختلافِ خیال یا واقعی لسانی خامیوں کی وجہ سے نئے شعراء کا کلام اعتراض کا مستحق قرار پا سکا ہے لیکن جوشش نے ہمیں پرکشتا نہیں کی بلکہ اس نظم میں ان شعراء کے متعلق یہ بھی کہا کہ

شاعری میں بیان سے سب کچھ

کاشش ہوتی یہ بات انھیں محسوس
خس نہیں ہے عندلیب اگر
اس سے پہلے گل آشیانہ خود کس

اقدار کا اس طرح گڈ بھجنا دہنی اور فکری انتشار ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اس نظم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری میں تو مضمون کا سوال ہی نہیں اندازِ بیان اصل چیز ہے اور اندازِ بیان کا یہ نقص ہے کہ میں ادائی جذبات کی صلاحیت نہیں۔ اس طرح ساری دنیا فنی صلاحیت صفر پر جاتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب شاعر کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہوں گے (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) تو اسے محض بیان کے دائرے سے باہر نکلنا ہی پڑے گا۔ الفاظ ہی سے کام لینا پڑے گا، لیکن یہ وہ الفاظ نہیں ہوں گے جو انی العنبر کے اظہارِ برت اور نہیں

یہ نظم میرا ایک نوٹ کے نقوش لاہور ۲۵-۲۶ء میں شائع ہوئی تھی تاکہ کسی جو عدویہ شاعر نہیں کی گئی ہے۔

ہیں بلکہ وہ ہوں گے جو "ذی حیات" ہیں، جو انسانی سماج کے مختلف عناصر میں رشتہ کا کام دیتے ہیں۔ جو شش نے خود اپنے ایک مضمون "الفاظ اور شاعر" میں اس بحث کو دلچسپ شکل میں پیش کیا ہے:

— روشنائی کو کاغذ پر روشنائی کی
 لکیریں نہ سمجھو، وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں نہ
 ہوا کی گڑبڑیں۔ الفاظ تو ذی حیات ہیں، انسانوں
 کی روح ذی حیات۔ الفاظ بھی آدمیوں کی
 طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، بڑھتے اور کھٹتے
 ہیں، گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ
 بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات و رسوم
 و روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں، ان
 کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و محاشر
 کا درواج ہے۔

شاعروں کو انھوں نے جہاں تک اختیار ہے
 رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل
 کر دیں ان کی لے اور رنگ بدل دیں، ان کا سرخ
 موڑ دیں ان کے صغوں میں تنگی یا وسعت پیدا
 کر دیں۔ شاعر کے سامنے آتے ہی ہر مسئلہ
 اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور احوال
 کا جھگڑا بھول جاتے ہیں۔ شاعر کا
 الفاظ کا عبادت گاہ ہے جہاں ادبی و علمی
 اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی
 صف میں اکھڑے نظر آتے ہیں اور صفوں

میں بس شائستگی ہوتی ہے جیسے راہنی کے
 باروں میں ہم آہنگی ہے۔

شاعر کے عمل تخلیق میں زبان و اظہار کا جو درجہ ہے اس کی اہمیت
 کسی طرح گھٹائی نہیں جاسکتی۔ جو شاعر بیان کے جادو کا مسکر ہو گا
 وہ شاعر نہیں ہو گا وہ جو اس کے لیے ریاض نہیں کرے گا وہ فن کی دیوی
 کو رام نہیں کر سکے گا لیکن جو محض بیان کو شاعری قرار دے گا وہ انسانی
 شعور کے افق کو روشن اور وسیع تر نہیں بنا سکے گا اور اسے "گل آشتی
 خورشید" "خس نشیں عندلیب" سے بہتر نظر آئے گا۔

اگر شاعر نے محض چند الفاظ کیجا نہیں کر دیے ہیں بلکہ کچھ کہا بھی ہے
 کوئی خیال بھی ظاہر کیا ہے تو فنی اقدار کے ساتھ ساتھ فکری اقدار پر بھی
 نظر ضرور جائے گی اس خیال کی صداقت اور عدم صداقت اہمیت اور
 عدم اہمیت سماجی زندگی سے اس کا تعلق اور بے تعلق اقدار حیات
 میں اس کا اضافی تناسب اور کہنے والے کے دوسرے خیالات سے اس
 کا ربط، ان تمام باتوں کی طرف ذہن جاسکتا ہے۔ اسے تنقید کہا جائے یا کوئی
 اور نام دیا جائے، اس طرح سوچنے والے کو نقاد کہا جائے یا کوئی دوسری
 اصطلاح استعمال کی جائے لیکن شریا نظم کے معرض اظہار میں آجانے
 کے بعد نقد و نظر کے لیے راہیں کھل جاتی ہیں۔ لیکن جو شاعر نے شاعریوں
 کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور شاعری کا جو تجربہ اپنی نظم نقاد
 میں کیا ہے اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ شاعرانہ
 اس کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کرنے والے کے درمیان کوئی قدر مشترک
 ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی شاعر کے دل کی بات جان ہی نہیں سکتا کیونکہ
 وہ باتیں الفاظ میں قید نہیں ہوتیں اور بیان کی گرفت میں نہیں آتیں۔
 اس کی مزید توضیح انھوں نے اپنی نظموں کے انتخاب سیف و سبوت کے

دیا چہ میں کی ہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا ہے کہ شعر شاعر کے دل کی بات ہی نہیں
 پیش کر سکتا لیکن یہ تو نہیں کہا ہے کہ نہ کسی نظم کے تعلق یہ رائے قائم
 نہیں کر سکتا کہ وہ کسی ہے؟ ایک نظم کب کہی گئی کیوں کہی گئی، کہتے وقت
 شاعر کا کیا عالم تھا، کیا کھایا تھا، کھانا سہنہ ہوا تھا یا نہیں، کوئی زور سے
 بول تو نہیں دیا تھا۔

جب تک یہ ساری باتیں کسی کو نہ معلوم ہوں وہ نظم کے متعلق کسی
 طرح کوئی اہم بات کہہ سکتا ہے اور اگر بالفرض محال وہ یہ تمام باتیں معلوم
 بھی کرے تو اپنے مزاج کو کیا کرے گا، وہ یا تو شاعر کا دوست ہو گا یا
 دشمن، دوست ہو گا تو محبت تنقید کی راہ میں حائل ہو گی، دشمن ہو گا تو نفرت
 رائے قائم کرنے دے گی۔ گویا ”تو“ میں تو شدم تو میں شدمی“ کی شرط
 پوری ہو گی نہ تنقید ممکن ہو گی۔ یہ ہے جو شمس کا استدلال۔ بہر حال ان کے
 نقطہ نظر سے تنقید ممکن ہو یا نہ ہو، تنقید کا عمل کسی کی کسی شکل میں جاری رہتا ہے
 پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار رکھنا سمجھ لینا اور طعنے اندوز ہونا نہیں
 شعوری زندگی کا ناگزیر جز بن گیا ہے اور اس اظہار کو تمدنی زندگی کے
 امتیازات میں گنا جاسکتا ہے۔

ابھی جو شمس کے نقطہ نظر کی تشریح اور تصورات کے تجزیہ کی بہت
 گنجائش ہے لیکن ان صفحات میں بھی شاعری کے متعلق ان کے خیالات کی بنیادوں
 کی کافی وضاحت ہو گئی ہے جس سے اہم نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔ متضاد اور
 مباعد امیر بیانات کے باوجود اتنا شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو شمس کا رجحان ایک
 تصور پرست عینیت پسند روحانی کار حجام ہے جو جالیا مولیٰ کی حیثیت
 سے نہیں وجدان کی حیثیت سے ذوق کار نہا بنانا چاہتا ہے انھیں ہر قدم پر
 وقت کے تقاضوں کا احساس ہوتا ہے اور ہر موڑ پر زمانے کی آواز سنائی
 دیتی ہے لیکن ان کی حقیقت پسندی و رمانیت اور تخیلیت اور سیلاب جذبات

کے سامنے نہیں ٹھہرتی اور وہ شاعر کے شعور سے زیادہ اس کے وجدان، اس کی پراسرار قوت اور شاعرانہ صلاحیت پر غلبہ و سادہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ شاعر سے حیات کی مصوری کے متعلق ہیں۔ لیکن اقدار حیات کے نہیں پرزور ہیں جیسے بھندوستان کے جہاد آزاری اور ترقی پسند تحریکات کے اثر سے انہوں نے موضوع اور مواد کی اہمیت، خیالات کی صحت مندی اور عظمت، نقطہ نظر کی جمہوریت اور افادیت پر بھی زور دینا شروع کیا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ اپنی نظموں کو نظر انداز کرتے گئے، فنی خصوصیات اور حسن بیان یا صحت زبان اور احساس جمال سے بے اعتنائی برتنا شاعری کے ساتھ غدا رہی ہے لیکن صحت زبان اور انداز بیان کے نام پر موضوع کی اہمیت اور مواد کی صحت کی طرف سے بے پروائی ظاہر کرنا شاعری کو بے جان بنا رہا ہے۔ جوش بار بار اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے یہ خیالات ان کے دوسرے افکار و تصورات سے ملا کر دیکھے جائیں گے تو معلوم ہو گا کہ ان میں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری کے محاسن اور معائب دونوں کو ظاہر کرتی ہے۔

رُومانیّت کا تجزیہ

جوش کے اندازِ شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے اکثر انھیں شاعرِ فطرت اور مستور جذبات کہا گیا ہے۔ اُن کی تخیل پرستی اور احساسِ نوازی کا تذکرہ کر کے انھیں رُومانیِ خالص کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ چیز کبھی مکمل کرمیٹ میں پیش کی جاتی ہے اور کبھی تخیل کے لیے اس لیے اس کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ چونکہ گوار دہیں رومانِ ادب یا رُومانیِ تحریک کے وجود کو باقاعدہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے لہذا سے تاریخ اور تنقید کی کتابوں میں جگہ دی گئی ہے لیکن رومانیت کی رُوح انفرادی طور پر بعض شعراء میں اور اجتماعی طور پر تاریخ کے ایک مخصوص دور میں نظر آتی ہے۔ انفرادی پسند و ناپسند سے اس کا اتنا گہرا رگاؤ ہے کہ جب کسی کوئی انفرادیت پسند اپنے عقائد اور خیالات کو سب سے اہم سمجھتا ہو اور ان کو شاہرہ بر گزر جاتا ہے تو رومانیت کا ایک ایسا انہوں جاگ اٹھتا ہے جسے کمنز ادبی ردائوں کی بددشمنی میں سمجھا جاتا ہو جاتا ہے۔ جو شمس کے ذہن اور تقاریبِ انفرادیت کی جو رو ہے وہ ان کے یہاں رومانیت کی تخلیق کرتی ہے۔ اس میں کمی اور عناصر مل کر اُسے خالص رومانیت نہیں رہتے دیتے یہاں اس کا تجزیہ مقصود ہے۔

یہ وہی ہے جہاں رومانیت کی تحریک نے جنم لیا، جہاں اس کے علمبردار اور مبلغین پیدا ہوئے، جہاں اس کے عناصر ترکیبی اور مابیت کا تجزیہ کیا گیا۔ یہاں کسی آج تک اس کی حقیقت اور اصلیت کے متعلق بحثیں جاری ہیں

اور نقادوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور دو شاخوں میں روایت کی تحریک کی تحریک کی حیثیت سے نہیں ہے نہ وہ کسی قدیم ادبی مسلک یا طرز خیال سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے بلکہ اگر ہم روایتی شاعری کی نفسیات ادبی خصوصیات اور طرز فکر کو بہتر نظر رکھ کر اردو شاعری کا مطالعہ کریں تو بعض سیاسی اور سماجی رجحانوں کی بنا پر اس کے واضح نقوش انیسویں صدی کے آخری چالیس سالوں میں یا پھر بیسویں صدی میں نظر آئیں گے۔

آزادی کی خواہش، مغربی فلسفہ اور ادب کے اثرات، سائنس اور نئے علوم سے شناسائی، فکری اور ذہنی آزادی کے جذبے نے ایک نئی دنیا کا خواب دکھایا اور جذبات نے اس میں رنگ آمیزی کی، انفرادیت پسند شاعروں نے اس دنیا کی رنگین تصویریں بنائیں، اس طرز پر روایت کے عناصر اور دو شاخوں میں جھنپائیاں ہو گئے، چونکہ روایت کے لیے شاعر کی غیر معمولی تخیل میں ایک لازمی چیز ہے اس لیے جن شعرا کے یہاں بھی شہت حاصل کے ساتھ ایک نئی جہان بناؤ ہو نہ ہو نکلے کی آرزو پائی جائے گی ان میں روایت کی بعض خصوصیتیں نظر آجائیں گی۔

اس سبب کہ بعض قدیم شعراء کے یہاں بھی رمان انداز مسکرا سکتے ہیں

لے یورپ سے آجائے روایت کی تحریک مختلف قسم کے سیاسی اور معاشرتی اثرات کے تحت اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی اس کی فلسفیانہ بنیادوں کا رد و قبول شدہ خیالات، اور نئے رجحانوں نے مضبوط کیا۔ ادبی مسلک کی حیثیت سے اس کی تاریک نشاۃ ثانیہ دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ ادب میں اس کا عروج دو دوروں کا ہے، ایک سیکڑی کیس اور بارن کے ہاتھوں پر، دہاں اصل بحث کلاسیکی اور روایتی ادب کے مقابلہ اور جیسے کہ ہے۔ اس جنگ نے توانِ تفصیل کی گنجائش ہے اور ضرورت۔

گو ان کے خیالات کی فلسفیانہ سیاسی اور سماجی بنیادیں واضح نہ ہونے کی وجہ سے تنقید جدید کے اصطلاحی مہنوم میں انھیں رومانیت پسند کہنا کچھ زیادہ درست نہ ہو گا۔ اس لیے اردو شاعری میں رومانیت کو کسی بنیاد پر تنقید کی شکل میں پیش کرنا ایک طرح کی تنقید ہے اور کچھ جاسکتا ہے مگر جو تنقید شاعری میں اس کا سراغ لگانا ان کی بہت سی خصوصیات کے سمجھنے میں نہیں ہو گا۔

رومانیت کیا ہے؟ رومانیت پسند شاعروں کے یہاں کون کون سی خصوصیتیں مشترک ہیں؟ مختصر ان باتوں پر نگاہ ڈال لینا جو شش کی رومانیت کے تجربہ میں مدد دے گا۔

انسان کی قوتِ احساس اور قوتِ تخیل لائقِ امداد مقامات پر زندگی کی بہتی ہوئی رُوح کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں کیونکہ جب ترتیب اور تنظیم میں یا مغز پر راہ پر چلتے ہیں، وہی، ذہنی اور روحانی آسودگی حاصل نہیں ہوتی تو عقل، احساس اور تخیل ہر ایک کی آزمائش ہوتی ہے اور جن لوگوں میں حالات کو بدلنے یا نئی زندگی کی تخلیق کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے وہ عقل یا خیال میں ایسا ضرر کر گزرتے ہیں کہ روحانی ذہن اپنی تخیلِ حسن کی زبردست قوت اور جوش کے وفور سے پہچانا جاتا ہے، احساس اور خیال کے مٹا ہرے ہی اسے عقل اور کردار کے منظم ہرے معلوم ہونے میں۔

اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تمام رومانی شاعر احساس و خیال کی ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے ان کی انفرادیت پسندی اور ذہنی نشوونما کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ وہ نشانِ پرستِ جنسِ عمل زندگی میں بھی کچھ کرنے کا موقع ملا ہے گفتارِ محض اور خیال پرستی کی بنیاد سے باہر بھی نکل پڑے ہیں۔ اچھے عقیدے پر شدت کے ساتھ یقین رکھنے کی وجہ سے اس کی اشاعت میں وہ علما بھی سرگرم کار ہو سکتے ہیں اس کی

خال سنیلیں اور ہارن کی زندگی ہے اس طرح گویہ بالکل صمیم ہے کہ ہر رومانی شاعر اپنے لیے ایک عینی دنیا بنالیتا ہے لیکن مادہ زندگی میں حور کا وہیں ڈالتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک خاص شکل میں حقیقت کا احساس بھی بھس رومان پسندوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن ان نام باتوں کے باوجود ان میں بن چیزیں مشترک ہوتی ہیں جو فنی قیود کے باوجود ان کے انداز بیان ہی جیسا نہیں ان کے خیال اور تصور میں بھی جھلک اٹھتی ہیں۔

ہر قیہ دہشت سے آزادی خیال اور احساس کی آزادی محدود کو لامحدود میں تبدیل کر دینے کی تمنا، ان دیکھیں دنیا میں جانے کی خواہش فلسفی جزروں کی تلاش خیالوں کی پر اسرار اور رنگین دادوں میں مگلشت بنے آسمانوں کی بلندی اور نئی زمین کی پستی، نئی دنیا اور دنیا ماحول، نئی جنسیں اور نئے جہنم، یار و زباج اور نیا پردہ و گار۔ یہ رومانی پردہ از دہن کی سرز میں ہیں۔ جب فلسفہ کا سہارا مل جاتا ہے تو ان خیالوں میں گہرائی بھی نظر آنے لگتی ہے چنانچہ خود یورپ میں جب رومانی تحریک کا زور ہوا تو فلسفہ نے اس کی مدد کی اور عینیت پسند فلسفیوں نے حقیقت و محض خیال اور تصور میں احساس بنایا۔ رومانی شعرا دیکھی بھالی، معمولی اور عامۃ الوجود چیزوں اور خیالوں میں بھی جدت اور غنایت کی جستجو کرتے ہیں۔ معمول اور مقرر سے ہٹنے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان میں انھیں ہر قدم پر حیرت کا عنصر نظر آتا ہے۔ عجیبوں اور بہاؤوں کی عظمت، انجمن کی معصومیت، جاہل، ہنگامی جہولان فطرت کے ماحول، ماضی میں کے، ان کو اس طرح اکساتے ہیں کہ وہ ان میں کوئی غیر معمولی قوت کو! صونہ نکالتا ہے۔

کار آج اور در در سورج جو رومانی تحریک کے فلسفی اور شاعر تھے شاعر سے اس بات کی امید رکھتے تھے کہ وہ نظری کو مافوق الفطرت

اور مافوق الفطرت کو فطری بنادینے کی صلاحیت کا مالک ہو گا۔
 تیسرا اور انقلاب کے اس عہد میں جب انقلابی قدریں بہت واضح
 نہیں ہوتیں جب مادی بنیادیں بہت مضبوط نہیں ہوتیں لیکن خیال
 اسودہ ہو جاتا ہے اس وقت رومانی انقلابی تصور بھی ایک اہم
 سماجی فرض انجام دیتا ہے اور زندگی کی مقررہ راہوں سے ہٹنے کی تلقین
 کر کے نئے تجربوں کی دعوت دیتا ہے۔ انھیں تجربوں کے لہجے سے ہی حقیقتوں
 کا انکشاف ہوتا ہے انھیں تجربوں میں خیالوں اور حقیقتوں کے تضاد
 سے انسان اس نظام حیات کی کھوج میں نکل کھڑا ہوتا ہے جو اسے
 سکون بخشنے اس راہ میں اگر سائنس کے اصول اور سماج کے مادی
 حقائق رہنما بن جاتے ہیں تو منزل مل جاتی ہے اگر نفس خیال کی شمع
 روشنی دکھائی ہے تو وہ صورت پیدا ہوتی ہے جسے میٹھو آئلڈ نے نیلی
 کا تذکرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے جیسا کہ ایک خوبصورت فرشتہ تھا جو
 اپنے جھکدار پروں کو خلا میں بے سود پھڑپھڑاتا تھا۔ رومانیت کا
 صحیح مطالعہ سماجی حقائق تک کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے چنانچہ جب
 ہم جوش کے رومانی تصورات کا جائزہ لیں گے تو ان کا سماجی اور
 تاریخی پس منظر بھی سامنے رکھیں گے کیونکہ ہم جوش کے ذہنی ارتقا کا تجربہ
 کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں کہ ان کی انفرادیت نے مختلف عناصر سے قوت
 حاصل کی ہے اور ہندوستان کی زندگی ان راہوں سے گزر رہی تھی چنانچہ
 رومانیت کے لیے بھی کافی مواد مل سکتا تھا

جس طرح یورپ میں ردِ سن کی انقلابی انسان دوستی اور فطرت پرستی
 پرستی اور بعض فلسفوں کے مادی تصورات نے رومانیت کو سارو
 رنگ عطا کیا اسی طرح ہندوستان میں جذبہ آزادی اور عقلیت
 پسندانہ رومانی تخیل کاری کو پربورماز بخشنے پر مدد عطا کردی اور مرد

اندازِ نظر میں زندگی کی رودر کئی اور آزادیِ خیال کا دم گھٹتا ہوا معلوم
 ہوا اس لیے ہر قید و بند کو توڑ کر فضا کے بسط میں آزادی کے ساتھ
 جکر لگانے، ہر کوہ و صحرا پر چھا جانے، ہر وادی و کھار پر برسے کی خواہش
 پیدا ہوتی۔ مستقیم ادارے غمگین خیز معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک ساری
 سفرِ راہیں چھوٹنے لگیں اور رومانِ افتادِ طبع رکھنے والے اپنی دنیا
 آپ بنانے لگے۔ چونکہ ہندوستان رومانیت پسندوں کے پاس کوئی
 مخصوص فلسفہ نہ تھا اس لیے وہ اپنی انفرادی قوتِ تخیل اور احساس
 کے بل بوتے پر آگے بڑھتے چلے گئے کچھ ایسے ان کے قدم حقیقت کی سنگین حُثان
 سے ٹکرائے اور انھیں ہوشِ آگیا، سمجھی وہ خواب و خیال کی وادی میں بے
 روک ٹوک پھلتے دُور نکل گئے۔ یہاں وجہ ہے کہ ان کے یہاں خلوص اور
 دیانت داری کے باوجود فریب و حقیقت کا انوکھا امتزاجِ غلط
 آتا ہے، رومان کی کبھی لذت پرستی ہی کو زندگی سمجھتا ہے کبھی عمل کی
 تلمیض کرتا ہے، کبھی مجبُوپ کے ساتھ جائزِ راتوں میں زندگی گزار دینے کو اصل
 حیات بناتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ شاعر کا فرضِ رہستہ دکھانا ہے کبھی
 کہتا ہے کہ شاعری سوداگری نہیں ہے، کبھی دنیا کے معاملات میں دخل
 دے کر انھیں سدھارنا چاہتا ہے کبھی دنیا سے مکمل علیحدگی کا پیام
 دیتا ہے۔ اس طرح رومانی شاعر مختلف روپ میں نظر آتا ہے، اور
 بظاہر ہر روپ میں خلص اور سنجیدہ رہتا ہے۔ کہیں وہ راہِ رو سے
 کہیں راہِ بر، کہیں مصلح ہے کہیں رند، کہیں مقلد ہے کہیں امام، کہیں
 رجعت پسند فلسفی ہے کہیں انقلابی تصور پرست، کہیں فطرت کا حق
 اس کے لیے سب کچھ ہے اور انسان اس کا محض ایک ادنیٰ پجاری اور کہیں
 انسان سب کچھ ہے اور فطرت اس کی کینز، لیکن ان تمام پہلوؤں میں جو
 بات یقینی ہے وہ اس کے احساسات کی شدت اور تخیل کی رنگینی ہے جس

سے چھو کر بر خیال قصے کرنے لگتا ہے اور ہر ادنیٰ سی چیز انوکھی نظر آنے لگتی ہے۔

جوش کی رومانیت اپنی بنیاد میں دوسرے رومان پرستوں سے مختلف نہیں لیکن بعض پہلوؤں پر زیادہ زور دینے، بعض حقیقتوں کا ایک خاص طرح ادراک کرنے اور بعض نقوش کوئی طرح اُبھارنے کے لحاظ سے ضرور مختلف ہے۔ جوش کے یہاں ارتقائے خیال کی جو مضامین آتی ہیں ان پر گہری نظر ڈالنے سے اتنا تو شروع ہی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض رومانی شاعر نہیں ہیں لیکن ان کی افتاد طبع میں احساس کی جو گرمی اور تخیل کی جو فراوانی ہے وہ خیال اور حقیقت کی کشمکش اب بھی موندے پا کر انھیں رومانیت کے اس گہوارے میں ڈال دیتی ہیں جہاں کرب اور مسرت کی سرحدیں مل جاتی ہیں انھیں کوسا ہوتا ہے کہ اب رومانی انداز نظر سے کام نہیں نکل سکتا لیکن اُن کا دل بے اختیار نہ اصرر کھینچتا ہے۔

خیر کا دودھ ہے لیکن مرے کبوت سینے میں

جنوں کی گاہے گاہے پر نشان اب بھی ہوتی ہے

رُومانیت کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ رنج و مسرت، نشاط و اہم دونوں کی انتہا پسندانہ شکلیں رومانی شعراء کے بہاں طغی ہیں اور جب مجموعی حیثیت سے اندازہ لگایا جائے تو گو نشاط کی دھوم دھام اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے لیکن گہرا اثر غم کا نظر آتا ہے۔ انگریزی کے تمام رومانی شاعروں کے لئے مجموعی طور پر وہی کہا جاسکتا ہے جو شیشی کے الفاظ میں ضرب النمل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

"OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL
OF SADDEST SONGS"

اور جسے جو شش نے ایک شرمیں یوں منظم کیا ہے
میرے رونے کا جس میں قصہ ہے
عمر کا بہترین حصہ ہے

نفا کا اور غم کا انتہا پسند از بیان تخیل کی گرمی کا بہتہ دیتا
ہے کو کرج اور "ورڈ سو رتھ" دونوں نے تخیل کو غیر معمولی اہمیت
دی ہے اور اس کی پراسرار قوت کو لفظوں میں ظاہر کرنے کی کوشش
کی ہے جو شش بھی اس فلسفی طاقت کے سامنے مبہوت رہ جاتے ہیں
رات کے ہنگام جب ہوتا ہے اک عالم خوش

باد خواب آور سے جل اٹھتی ہے یاں قندیل ہوش

کھولتی ہے اپنے شہر جب پہلی موت کی

دوڑ جاتا ہے مری بھتوں میں خون زندگ

کوئی پراسرار قوت کوئی روح منتقم

شر کینے کو مرے ہاتھوں میں دیتی ہے قتل

دفعہ چھڑتے ہیں پھر ارض و سما کے زلزلے

اک اک ان کی داریں میں گھیر لیتی ہے ننھے

دل میں ہوتا ہے مرے نادر خیالوں کا ہجوم

مسکرا کر دیکھنے لگتے ہیں گردوں سے بخوم

بہر یا اسی فرشتوں کو صدا دیتا ہوں میں

آسمان کو اپنے قدموں میں جھکا لینا ہوں میں

لکھ رہا ہوں کیا نہیں ہوتی مجھے مطلق منبر

انگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے منظر

یوں قلم کرتا ہے جنبش ہاتھ میں بے اختیار

اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار

وں فضا میں نقش ابھرتے ہیں فترانے ہوئے
 جس طرح ساحر کے لب فوں کو دہراتے ہوئے
 کس قدر اسرار سے سمجھ میں جلوے ترے
 اے تختہ خیز عارض سبلی تخیل کے
 تو پری ہو یا فرشتہ روح ہو یا دھبہ
 آگہی دن میرے آگے شکل انسانی میں آ

تخیل کے پھول انکو نشانہ ص ۲۴

تخیل کا یہی وہ تصور ہے عینیت پسند جسے اہمیت دیتے ہیں اور
 بعض اوقات اسے حقیقت سے ارفع قرار دے کر سب سے بڑی تخلیقی قوت
 ٹھہرا دیتے ہیں اس سے ملتی جلتی وہ ذہنی کیفیت بھی ہے جہاں کا اظہار جذبہ کو عقل پر ترجیح
 دینے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور فطری خواہشات کی غفلت اور معصومیت
 اس کے نزدیک مسلم ہوتی ہے۔ روستو جسے یورپ کی رومانی تخریک کا باب
 کہا جاتا ہے۔ فطرت کی اسی معصومیت کو سمجھتا تھا اور جذبات کی آزاد
 نشوونما کو فطری انسان بننے کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ
 جوشس نے روستو کا مطالعہ کیا تھا یا نہ کیا ہے یا نہیں لیکن ان کے خیالات
 میں روستو کے فلسفہ کی آواز بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ لکھتے ہیں

ہم فطرت سے اس قدر دور ہو چکے ہیں اور وہ بڑے ذراں ہر صفت
 کے ساتھ اُٹھ ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ سوچ کہ دل پر ایک ہشت
 سی طاری ہو جاتی ہے کہ آخر انسانیت فطرت دشمن کی کس منزل پر
 جا کر دم لینے والی ہے۔ یہ کیا ہے کہ بدقسمتی سے انسان اب قدن کے
 اس نقطہ پر آچکا ہے کہ کامل طور سے فطری زندگی بسر کرنا تقریباً